ایک علمی تحریک کا دینی، علمی، فکری، ادبی اور اصلاحی ترجمان

ماہنامہ ندائے اعتدال علی گڑھ

فروری ۲۰۱۷ء

ایڈیٹر

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

فہرست مضامین

۱-	قرآن کا پیغام	دعوت بالقرآن	علامہ سید سلیمان ندویؒ	
۲-	اداریہ	سیاسی افلاس	مدیر	۳
۳-	خاص تحریر	شامی مہاجرین کا آنکھوں دیکھا حال	مفتی ابولبابہ شاہ منصور	۷
۴-	پیام سیرت	تو نہ روٹھے جو روٹھ جائے زمانہ سارا	محمد فرید حبیب ندوی	۱۰
۵-	خصائص و امتیازات	امت محمدیہ کے علماء کے امتیازات وخصوصیات	محمد قمر الزماں ندوی	۱۳
۶-	اسلامی تعلیمات	قضائے حاجت کا اسلامی طریقہ-حکمتیں ومصلحتیں	محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی	۱۶
۷-	فکر اسلامی	مفکر اسلام-ایک مطالعہ، قسط-۱۱	ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی	۲۳
۸-	اصلاح و تربیت	تزکیہ نفس اور اس کے طریقے	حافظ کلیم اللہ عمری مدنی	۲۶
۹-	تاریخ کے جھروکوں سے	علم ریاضی اور ہندوستانی علماء	طلحہ نعمت ندوی	۲۸
۱۰-	تنقیدی مطالعہ	تفسیر ثنائی: ایک علمی مطالعہ	نذیر احمد علائی	۳۱
۱۱-	تجزیہ	ترقی یا انحطاط اور تنزلی	مفتی رحمت اللہ ندوی	۳۷
۱۲-	// //	میں الزام ان کو دیتا تھا......	ابوفہد	۴۰
۱۳-	نقطۂ نظر	اختلاف کے ساتھ اتحاد	محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی	۴۳
۱۴-	// //	میرے ووٹ دینے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟	محفوظ الرحمٰن انصاری	۴۵
۱۵-	احساس ذمہ داری	اسلامی شریعت کے بارے میں...........	محمد مجاہد ندوی	۴۷
۱۴-	ادبی شخصیات	امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت	نایاب حسن	۵۲
۱۵-	زبان و تہذیب	ہم بھی منھ میں زبان رکھتے ہیں	مفتی محمد تقی عثمانی	۶۰
۱۶-	آخری صفحہ	نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب	م-ق-ن-	۶۳
۱۷-	شعر و ادب	نظم (یوم جمہوریہ کی نسبت سے)	مولانا عامر عثمانیؒ	

❁❁❁

نوٹ: مضمون نگار کی رائے سے ادارہ کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔عدالتی چارہ جوئی علی گڑھ کی ہی عدالت میں ہوسکتی ہے۔

اداریہ

سیاسی افلاس

جس وقت یہ شمارہ قارئین کے ہاتھ میں ہوگا اس وقت وطن عزیز کی تاریخ میں ہمارے صوبے کے رائے دہندگان بڑا اہم باب رقم کررہے ہوں گے، تقریباً 10 فروری تک شمارہ پہنچے گا اور 11 فروری کو پہلے مرحلے کے انتخابات ہیں، بعض قارئین کو یاد ہوگا کہ جب مرکز میں فسطائی حکومت بنی تھی تو راقم نے دو باتیں لکھی تھیں: ایک تو یہ کہ خوف وہراس کی فضا بنانا اور سمندر میں رہ کر مگر مچھ سے بیر رکھنا درست نہیں___ حکومت کو باور کرانا چاہیے کہ ہم اس ملک کے باعزت شہری ہیں، ہمارے مسائل ہیں، مطالبات ہیں، ان سے روبرو مذاکرات ہونے چاہئیں اور کچھ نہ سہی تو دعوتی نقطہ نظر سے ملاقاتیں تو جاری رہنی چاہیے تھیں، دوسری بات یہ لکھی تھی کہ یوپی اور بہار میں اگر مسلمانوں نے صوبائی انتخابات میں ہوش کے ناخن نہ لئے تو راجیہ سبھا میں فسطائی جماعت کی اکثریت ہوگی اور پھر من مانی قانون سازی ہوگی اور دستور کی دھجیاں اڑیں گی، ہماری اس تحریر کے ٹھیک چھ-سات ماہ بعد ایودھیا کے ایک پروگرام میں مرکزی وزیر داخلہ سے صحافیوں نے سوال کیا کہ آپ لوگ مندر کب بنائیں گے، جواب ملا کہ لوک سبھا کے ساتھ راجیہ سبھا میں بھی اکثریت دلا دیئے ہم قانون پاس کر کے مندر بنائیں گے، موجودہ صورت حال ان عزائم کو مزید صاد کرتی ہے، عوام کے ذہنوں میں جس طرح زہر گھولا گیا ہے، اس کے نمونے سامنے آتے رہتے ہیں، ڈکٹیٹر شپ جس انتہا کو پہنچ رہی ہے وہ سب دیکھ رہے ہیں، اس صورت میں ہمارے صوبہ کے انتخابات بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ بہار میں مسلمانوں نے بڑی دانشمندی کا ثبوت دیا اور وقت پر سیاسی جماعتیں بھی عجب انداز میں متحد ہوگئیں، مگر اتر پردیش خطرے میں ہے، اور خطرہ ایسا نہیں جس سے صرف صوبے کو نقصان ہو، خطرہ پورے ملک کو لاحق ہے، دستور کو خطرہ ہے، جمہوریت کو خطرہ ہے، تشخصات خطرے میں ہیں، آزادی تو تقریباً سلب ہو چکی ہے، کیا آپ کو محسوس نہیں ہوتا کہ زبانیں کاٹ دی گئی ہیں، ہاتھ باندھ دیے گئے ہیں، انگلیاں قلم کر دی گئی ہیں، لوگوں کی جیبیں خالی کر دی گئی ہیں، پورے ملک کی دولت پر ڈاکہ ڈالا گیا ہے، ہر شخص کو برہنہ کر دیا گیا ہے، عالمی بینک، آئی، ایم، ایف اور ورلڈ اکنامک فورم کی رپورٹ حکومت ہند کے فیصلوں پر سوال اٹھاتی ہے اور ہندوستان کو ابھرتی ہوئی معیشتوں کی درجہ بندی میں ۶۰ ویں نمبر پر رکھتی ہے، حیرت کی انتہا نہ رہی جب یہ دیکھا کہ وطن عزیز ابھرتی ہوئی معیشتوں میں مفلوک الحال بنگلہ دیش و پاکستان سے بھی پیچھے چلا گیا ہے، جس کی بڑی وجہ نوٹ بندی ہے، لیکن کوئی ہے جو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکے، ہر آزاد شخص سہما ہوا ہے، نہ کوئی

فریق مخالف ہے، نہ زندگی کے آثار ہیں، نہ کوئی احتجاج ہے، سب خاموش تماشائی ہیں، بے موسم کی شہنائیاں بجتی رہتی ہیں، بے موضوع راگ بھی الاپے جاتے ہیں، ملک اور ملی تشخص بارود کے ڈھیر پر ہے اور ہم ''شراب کہن'' پی کر مخمور ہیں، نہ کوئی منصوبہ ہے، نہ متحدہ قیادت، نہ اجتماعی قوت فیصلہ، نہ ایک دوسرے کی تصدیق وتائید، الگ الگ رائے ہیں، جن کے پیچھے مفادات کے بندے بھی ہیں اور بعض مخلصین بھی، لیکن کوئی کسی کی سننے کو تیار نہیں ____ **صحیح معنی میں ملت اسلامیہ ہند نے شاید ہی فکری وسیاسی افلاس اور جرأت ودانش مندانہ سیاسی قیادت کے فقدان کا کوئی ایسا دور دیکھا ہو۔**

آپ تو جانتے ہیں کہ سیاست دین سے جدا ہو تو چنگیزی رہ جاتی ہے، آخر سیاست کو دین سے کیوں جدا کیا گیا، کیا دین کو سیاست کی ضرورت نہیں، کیا سیاست ایک کارگر وسیلہ نہیں، کیا وہ تحفظ کا ذریعہ نہیں، کیا اس ملک میں اس کی بالا دستی نہیں، کیا ماضی میں ہماری قوم اس کی امام نہیں رہی، کیا سیاسی گلیاروں میں سفید پوش کا سۂ گدائی لے کر پھرتے نہیں، ایک امت کو جملہ شعبہ ہائے زندگی میں جس طرح افراد کار کی ضرورت ہے اسی طرح سیاست کے میدان میں رجال کار درکار ہیں، آخر سیاست کا وہی مفہوم اور وہی استعمال ہمارے علماء کے نزدیک کیوں ہے جو عام انسانوں اور وقتی مفادات کے بندوں کے نزدیک ہوتا ہے، آج جو استبدادی قوت ابھر کر آئی ہے، جس طرح مسلمانوں کو حاشیہ پر لا کھڑا کیا گیا ہے، جس طرح ان کے ووٹ کو فٹبال کی حیثیت دی گئی ہے وہ کسی سے مخفی نہیں، سوچیے ذرا سیاست سے اس قدر بیر اور سیاست دانوں کی اس قدر تحقیر؛ لیکن ہم ہی ان سے لائن لگا کر ملتے ہیں اور ملنے نہ جائیں تو ان کے استقبال میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے، ترکی میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے علمبردار افراد میں سے ایک مرد جلیل پروفیسر نجم الدین اربکانؒ تھے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ **''اگر تم سیاست سے کنارہ کشی اختیار کرلو گے تو تم پر ایسے لوگ مسلط ہوں گے جو تمہاری طرف توجہ نہیں دیں گے''**، اسی بات کو ہمارے شہر کے ایک غیر مسلم سیاست داں نے یوں کہا، **''کیا وجہ ہے کہ ہم اپنے بچے کو سب کچھ بنانا چاہتے ہیں مگر اسے قائد بنانے کی خواہش نہیں رکھتے، جب ہم یہ میدان خالی چھوڑ دیتے ہیں تو پھر یہ جگہ مفاد پرست، فسادی اور جاہل وغنڈے لے لیتے ہیں''**، موصوف ۲۶ جنوری کے پروگرام میں ہمارے مدرسہ میں بحیثیت مہمان خصوصی آئے تھے اور طلبہ کی تقریریں سننے کے بعد اس خیال کا اظہار کیا تھا ____ ہماری کوشش ہوتی ہے کہ ملکی حالات اور دعوتی نقطۂ نظر سے انتظامیہ یا سیاست کے بااثر غیر مسلم افراد کو ایسے پروگراموں میں مدعو کر کے اپنے کو دیکھنے، سننے اور مدرسہ سے واقف ہونے کا موقع دیا جائے، ایسے مواقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان تک دعوتی، تعارفی لٹریچر اور قرآن پاک پہنچایا جائے ____ بہرحال اس ملک میں یہی ہوا اور اس کے نتائج ایسے خطرناک ہورہے ہیں جن کا اس وقت ہمیں ادراک تک نہیں، ہمارے وہ نوجوان جو ملک وملت کی تقدیر بدل سکتے تھے آج مجبوراً وہ دوسروں کے تھیلے اٹھائے پھرتے ہیں، ہماری قیادتوں نے انہیں اس طرح چھوڑ دیا کہ آج وہ اغیار کی جے جے کار کرتے ہیں، اور اس کے نتیجہ میں وہ اپنے دین وایمان کا سودا بھی کر لیتے ہیں۔

اگر علماء کرام براہ راست سیاست نہ کرتے ،مگر اپنی سر پرستی میں کم از کم ان نوجوانوں کو سیاسی عمل کے لیے تیار کرتے ، ان کی تربیت کرتے تو کیا آج یہ دن دیکھنا پڑتا ،ہم نے گذشتہ اداریہ میں لکھا تھا کہ مشکلات سے کوئی جوجھنا نہیں چاہتا لذت کام ودہن کے سب طلبگار ہیں، **آخر جز وقتی سیاست، کام نکالنے والی سیاست، کسی کی غلامی کا طوق ہی گلے میں ڈالنے والی سیاست ہماری گھٹی میں کیوں پڑی ہے،** حضرت مولانا علی میاںؒ فرمایا کرتے تھے کہ ہمیں یہ باور کرانے کی ضرورت ہے کہ ہم صرف فائدہ ہی نہیں پہنچا سکتے ہیں، نقصان پہنچانے کی بھی صلاحیت رکھتے ہیں، مزید فرماتے تھے کہ ہم کو صاف بتا دینا چاہیے کہ ہم نے کسی کا طوق غلامی گلے میں نہیں ڈال رکھا ہے، لیکن افسوس ہم جزئیات میں پھنس کر تقسیم ہو گئے، حیرت تو تب ہوتی ہے **جب ہم عہد مکی کی دہائی دیتے ہیں، اور مدینہ کا مستقبل ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے، جیسے ہم عہد مکی میں ہی جینا چاہتے ہوں، عہد مکی کی بھی پوری حکمت عملی ہمارے سامنے نہیں ہوتی، ذرا غور کیجیے مکہ میں مسلمانوں کی چھوٹی سی اقلیت، نہ وسائل مہیا اور نہ کوئی طاقت، عجب بے سروسامانی کا عالم، قرآن مجید نے عجیب منظر کشی کی ہے کہ وہ وقت یاد کرو جب تمہاری تعداد اتنی کم تھی کہ تم کو ہر وقت خطرہ رہتا تھا کہ کہیں کوئی تم کو اچک نہ لے، لیکن ان ہی خوفناک حالات میں، مظالم کی چھاؤں میں کلمہ لا الہ الا اللہ کی حقیقت کو سمجھا گیا اور تیاری کی گئی، اسی چھوٹی سی اقلیت سے حضورؐ نے مکہ میں یہ فرمایا "کلمة تقولونها تملكون بها العرب وتدين لكم بها العجم" جو کلمہ میں لے کر آیا ہوں اس کی حقیقت کو سمجھ لو اور تسلیم کر لو، تو عرب وعجم کے مالک بن جاؤ گے، مکہ مکرمہ کے حالات سامنے رکھیے، اس جملہ پر غور کیجیے اور سوچیے کیا ہم نے اس طرح کبھی سوچا، اور کیا اس طرح ہم نے نوجوانوں کو جوڑنے اور ان کی تربیت کرنے کی ذمہ داری نبھائی، کیا ہم نے اس طرح کی کوئی جماعت تیار کی؟؟؟**

بڑی بڑی باتیں کرنے والوں اور زور خطابت سے دل جیتنے والوں کو بھی زمین پر اتار کر دیکھا تو حقیقت کچھ اور نظر آئی، اب سوال یہ ہے کہ آئی بلا اگر ٹل جائے تو بھی مستقبل کے لیے کیا اب کچھ لوگ سوچنے کو تیار ہوں گے، ویسے آئی بلا کیسے ٹلے گی؟؟

وہ ایک شخص جس نے عین وقت میں بہار میں دھوکہ دیا تھا اور فسطائی جماعت کی راہ ہموار کرنے کا جھنجلاہٹ میں ہی صحیح ،مگر اعتراف کیا تھا، اس نے یوپی میں بھی عین وقت پر ایک ڈرامہ اسٹیج کر دیا اور اپنے بس بھر پوری کوشش کر دی کہ اپنے آقاؤں کے لیے راہ ہموار کر دے، اب مسلمانوں کی تقسیم تو طے ہے، کیوں کہ ہمارے درمیان کچھ وہ ہیں جنہوں نے باپ کے یہاں دعوتیں کھائی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو بیٹے سے افطار پارٹی کے دعوت نامے طلب کرتے رہے ہیں، رہ گئیں دوسری جماعتیں تو چارہ ڈالنے میں وہ بھی ان سے پیچھے نہیں ہیں اور نشتر لگانا تو سب کا اجتماعی اور مشترک عمل ہے، مسلمانوں کا ووٹ قربانی کے گوشت کا ایک ڈھیر ہے، سب اپنا اپنا حصہ تقسیم کر لیتے ہیں، البتہ نہ رضائے الٰہی مقصود ہوتی ہے اور نہ اس کا خیال، پھر کوئی ثواب نہ ملے تو شکوہ کیسا۔

بظاہر چوہے بلی کا کھیل ختم ہو گیا ہے، باپ چاروں خانے چت ہو گیا اور بیٹا فتح یاب، مزید یہ کہ آزادی سے اب

تک استحصال کرنے والی جماعت سے اتحاد کا بھی قوی امکان، حکمراں جماعت میں جشن کا ماحول ہے، مگر لکھنے والے نے صحیح لکھا ہے ''......لیکن عوام پر اس لڑائی کے کیا اثرات مرتب ہوئے ہیں وہ تو گیارہ مارچ کو معلوم ہوگا''، کیوں کہ ہم کو اب بھی اس کا یقین ہے کہ یہ کھیل کہیں نہ کہیں کسی اور کی نفع رسانی کے لیے سوچی سمجھی سازش کے تحت کھیلا گیا ہے، اگر چہ تجزیہ نگاران اس کے اور بھی پہلو ذکر کرتے ہیں جن کے امکان کو یکسر خارج نہیں کیا جاسکتا، لیکن یہ بات قابل غور ہے کہ از ابتدا تا انتہا دونوں گروپ ایک دوسرے پر بی جے پی کو فائدہ پہنچانے کا الزام لگا رہے تھے۔ اور آخر میں باپ نے یہ بھی کہہ دیا کہ''...... وہ اب آر ایس ایس کے نقش قدم پر چل رہے ہیں'' اس جملہ میں خاموش پیغام تھا کہ ہندوؤں کو اب بیٹے کو خالص ہندو سمجھنا چاہیے اور واقعہ یہی ہے کہ یہ ڈرامہ One man show کی راہ ہموار کرنے اور ایک چچا کو بے دخل کر کے بالکل لوک سبھا انتخابات میں مودی کی طرح بیٹے کی شبیہ پیش کرنے کے لیے رچا گیا اور ترقیاتی کاموں کا سہارا لیا گیا لیکن براہ راست مسلمانوں کا اس سے کیا فائدہ، کچھ تجزیہ نگاران کا یہ بھی کہنا ہے کہ دلت جماعت کو بھرپور اکثریت کے ساتھ کامیاب کرنا ہی دانش مندی ہے، کئی ایسے ٹھوس تجزیاتی مضامین نظر سے گزرے جو اس نظریہ کو صاد کرتے ہیں اور یہ بھی اشارہ کرتے ہیں کہ فی الوقت بی جے پی کا کامیابی سے زیادہ بی ایس پی کو شکست دینا مقصد ہے تا کہ 2019 کے انتخابات میں اس شکست سے منتشر ہوئے دلت ووٹ کا فائدہ راست طور پر اسے پہنچے، اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام سروے رپورٹ اصل مقابلہ آرائی فسطائی طاقت اور دلت جماعت کے درمیان ہی دکھا رہی ہیں، **مسلمان فی الوقت یہ کر سکتے ہیں کہ جہاں کہیں بھی دلت جماعت کا امیدواران کے ووٹ سے کامیابی کی پوزیشن میں ہو اس کا میاب بنائیں، ورنہ صحیح بات یہ ہے کہ آپ کسی کی حمایت کریں یا مخالفت کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ آپ کے پاس اجتماعی طاقت ہے، نہ سیاسی قیادت اور نہ اجتماعی ملی شعور فی الوقت بس اپنے آپ پر ماتم کیجیے؛ لیکن صرف ماتم پر اکتفا نہیں کرنا ہے فوری ضرورت یہ ہے کہ استغفار کا اہتمام کیجئے؛ اللہ سے دعا کیجئے اور اللهم انا نجعلك في نحورهم ونعوذبك من شرورهم اور ربنا لا تجعلنا فتنة للقوم الظالمين ونجنا برحمتك من القوم الكافرين کا ورد کیجئے اور عملاً اتنا کر لیجئے کہ آپ جہاں ہوں سینہ بہ سینہ لوگوں تک یہ بات پہنچائیے کہ جہاں جو شخص فسطائی جماعت کے امیدوار کو ہرانے کی پوزیشن میں ہو بس اسی کو ووٹ دیا جائے، اور ووٹ ضرور دیا جائے؛ بلکہ دوسروں سے ووٹ ڈلوانے کا اہتمام کیا جائے، مقامی اور علاقائی سطح پر بھاجپائی امیدوار کو شکست دینے کے لئے ہر طرح کے مفاد و تعصب سے بالا ہو کر جو مقابلہ میں مضبوط ہو، اس کو خاموشی کے ساتھ جتانے کی فکر میں لگ جائیے، یہی وقتی حکمت عملی ہے اور یہی سیاسی طور پر پسماندہ قوم کا سہارا۔**

☆☆☆

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی

❑ خاص تحریر

شامی مہاجرین کا آنکھوں دیکھا حال

مفتی ابولبابہ شاہ منصور

سنا تو تھا کہ آنکھوں دیکھی اور ہوتی ہے، سنی سنائی اور۔ ''دیدہ کے بود مانند شنیدہ''، لیکن دیکھنے اور سننے میں اتنا زیادہ فرق ہوگا اور اس قدر المناک اور روح فرسا فرق ہوگا۔ اس کا تصور بھی نہ کیا تھا۔

سمجھ نہیں آتا بات کہاں سے شروع کی جائے۔ شام کے مہاجرین کی دل فگار مظلومیت بیان کی جائے اور اہل دل کو بتایا جائے کہ آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ معصوم بیٹیاں جو کربلا سے بچ کر شام آ گئی تھیں، ان پر کیا گزر رہی ہے؟ یا ترکی کے انصار کی ہمت، سخاوت اور عزیمت کا ذکر کیا جائے جس نے انصارِ مدینہ کی یاد تازہ کردی ہے؟ یا دنیا بھر میں حقوق انسانی کا واویلا کرنے والی اور حیوانوں کے غم میں مری جانے والی دوغلی تنظیموں کی حقیقت آشکارا کی جائے جن میں سے ایک بھی... میں دہراتا ہوں... ایک بھی یہاں موجود نہیں ہے۔ یا پھر مسلم حکمرانوں کی بے حسی اور صاحب حیثیت مسلمان بھائیوں کی بے بسی کا رونا رویا جائے جو شام کے مظلوموں پر شام غریباں کے چھائے بادل گرجتے برستے دیکھ کر بھی ہونٹ سیے ہوئے ہیں؟؟؟ حکمرانوں نے زبانوں پر تالے ڈال لیے ہیں اور عوام آنکھیں بند کر کے عافیت کی باقی ماندہ گھڑیاں باری آنے تک گزار رہے ہیں۔

شام کی سرحد کے ادھر الگ عالمی طاقتیں اپنا کھیل کھیل رہی ہیں۔ روس کا مسئلہ یہ ہے کہ ارض العرب میں امریکا کے پاس کئی اڈے موجود ہیں، اس کے پاس صرف شام کا نیول بیس ہے۔ وہ اسے کسی صورت جانے نہیں دیتا۔ چاہے چین کے ساتھ اشتراک ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ فارس کا مسئلہ یہ ہے کہ "غلبت الروم، فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون" کی معجزانہ پیشین گوئی کے چودہ سو سال بعد اسے بازی اپنے حق میں پلٹنے کا موقع ملا ہے جسے وہ کسی قیمت پر ضائع نہیں کرنا چاہتا۔ امریکا بہادر کا مسئلہ یہ ہے کہ گیم کے ''سلیپنگ پارٹنر'' کو گریٹر اسرائیل کی طرف پیش قدمی کے لیے شام کو تقسیم کرنا اور ترکی کو کمزور کرنا اسے ناگزیر نظر آتا ہے۔

نہ رہے گی شام کے پاس گولان کی پہاڑیاں اور نہ بجے گی فلسطینی مزاحمت کی بانسری، لہٰذا شام کا مسلمان دوطرفہ پس رہا ہے۔

خاصہ خاصان رسل کی آل پر وہ وقت آن پڑا ہے کہ شیخ عزالدین عبدالسلام اور شیخ احمد رفاعی کے معزز و مکرم خاندانوں کی وہ بیبیاں جن کو کربلا کے میدان نے نہ دیکھا تھا، آج

ریحانیہ، عرفہ اور غازی عینتاب کے کیمپوں میں کھلے آسمان تلے زیتون کے تیل اور زائر کے چورن کے ساتھ زندگی کی گھڑیاں بتانے پر مجبور ہیں۔

ترکی کی سرحد کے ادھر عجیب ایمانی اور انصاری کیفیات ہیں۔ خدا کی قسم! قارئین عجیب کیفیات ہیں۔ جس قصبہ نما چھوٹے سے شہر میں فقیر بیٹھا یہ سطریں لکھ رہا ہے، مقامی آبادی 90 ہزار ہے، جبکہ مہاجرین کی تعداد ایک لاکھ بیس ہزار ہو چکی ہے۔ سرحد کے دونوں طرف کی خبریں بتا رہی ہیں کہ اللہ نہ کرے *حلب* کے بعد *ادلب* کے سقوط کا سانحہ شاید ہونے والا ہے۔ تب حلب کے وہ مہاجر جو ادلب چلے گئے تھے۔ ان کا ریلہ جب ادلب والوں کے ساتھ آئے گا تو ان کی خدمت کے بوجھ کا کیا عالم ہوگا؟ اس کے تصور سے یقین مانیے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ جس طرح مہاجرین دونوں طرف سے پس رہے ہیں، اسی طرح انصار بھی نیٹو اور فیٹو دونوں کے درمیان گھرے ہوئے ہیں۔

ایک طرف کرنسی گر کر آدھی قیمت رہ گئی ہے تو دوسری طرف نصرت کے لیے درکار وسائل کی کئی گنا زیادہ ضرورت عنقریب پڑنے والی ہے۔ خوشی کی باتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ وہ طبقہ جو اسلام پسند سلیم الطبع ہے، ان کا مقابلہ ہو رہا ہے کہ کون سا شہر امداد کے زیادہ سے زیادہ کنٹینر بھیجتا ہے، جبکہ گولنسٹ اور سیکولر یا قوم پرست حضرات ردگانی دیوار کو کمزور ہوتا دیکھ کر ایک اور دھکے کی تیاری کیے ہوئے ہیں۔ دوسری یہ کہ اردگان کے تیار کردہ رضا کاروں کی تنظیم، تدبیر اور خاموش مستعدی دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کس ملکوتی مٹی سے ان کا خمیر اٹھایا گیا ہے؟

آپ یقین کریں گے کہ جس مرکز میں ایک لاکھ روٹی یومیہ پک رہی ہیں، اس کا صرف ایک نگران ہے اور اتنا چوکس ہے کہ مہمانوں کے جوتے اندر جانے سے پہلے صحیح جگہ رکھوانے سے لے کر ان کی قومیت، تعارف اور کردار ہر چیز پر اس کی عقابی نظر ہے۔ بھاری بھرکم کنٹینروں کی کھیپ آ جائے یا نئے کیمپ کے لیے زمین ہموار کر کے نئے خیموں کی پیشگی تیاری ہو، اس قدر خاموشی اور تیز رفتاری سے کام ہوتا ہے کہ سمجھ سے باہر ہے۔ یہ خودکار انسانی تربیتی نظام وضع کس نے کیا ہے؟ اس مردِ بیمار میں عقابی روح پھونکی کس نے ہے؟ یہ رضا کار لگتا ہے کہ کسی طویل تربیت سے گزر کر غفاری و قہاری اور قدوسی و جبروت میں ڈھل چکے ہیں۔ انسانیت کے خیرخواہوں میں سے نہ تو یہاں کوئی عالمی ادارہ ہے نہ این جی اوز، الٹا ان امدادی مراکز پر دو مرتبہ حملہ کروایا جا چکا ہے، اس لیے بہت قہرناک قسم کا حفاظتی نظام ہے جہاں کسی کو قریب پھٹکنے کی اجازت نہیں، لیکن جیسے ہی انہیں پتا چلتا ہے کہ یہ پہلا پاکستانی ملاّ صحافی ہے جسے اس جگہ قدم رکھنے کی سعادت حاصل ہوئی ہے تو جس تیزی سے ان کی کرختگی اور درشتی محبت اور ملاطفت میں تبدیل ہوئی ہے، وہ منظر بھی قابل دید ہوتا ہے۔ اندرونی ملک دھماکے، بیرون ملک سے بڑھتا دباؤ اور پنپتی سازشیں، ادلب کے سقوط کا اندیشہ، امدادی مراکز اور قافلوں پر حملے کا خوف، کوئی چیز ان کو نئے مہاجرین کے انتظام سے روک سکتی ہے نہ پہلے سے آئے مہاجرین کے لیے رہائش، صحت اور تعلیم کے اعلیٰ اور معیاری انتظام سے۔

واللہ! اگر صرف ان چند دارالیتامیٰ کا حال بیان کروں جنہیں اب تک دیکھنے کا موقع ملا تو مجھے یقین ہے ان سہولتوں کا قارئین یقین ہی نہیں کریں گے جو ان بے آسرا بچوں کو اس نظریے کے تحت فراہم کی گئی ہیں کہ یتیم کی کفالت نہ صرف رحمت خداوندی کے متوجہ ہونے کا ذریعہ ہے، بلکہ آمنہ کے لعل

(صلی اللہ علیہ وسلم) سمیت تاریخ کے بڑے بڑے لوگ یتیمی کا شکار ہوکر بھی امت کی بے چارگی کے وقت غیر متزلزل سہارا بن گئے تھے۔ خاص کر شام کے یتیم کہ کوئی کسی نبی کی آل ہے، کوئی کسی صحابی کی ذریت اور کوئی خدا جانے کس ولی کی اولاد؟ اللہ ہی جانے کون کیا ہے؟ لیکن ان سارے مناظر میں ہم کہاں کھڑے ہیں؟ واہ میرے مولا! ہماری مسلسل ناشکری کے باوجود تو ہمیں وقتاً فوقتاً کیسے کیسے مواقع فراہم کرتا اور کیسے کیسے اعزازات سے نوازتا ہے۔ حرمین کی حفاظت سے لے کر حرم قدسی کی طرف سے آنے والی دجّالی یلغار کے سامنے بند باندھنے تک، نہ انڈونیشیا آئے گا نہ ملائیشیا، بنگلہ دیش میدان چھوڑ چکا ہے اور مصر نے آنے سے صاف انکار کر دیا ہے۔ لے دے کر بات پھر پاکستان پر اور اعزاز پھر پاکستانیوں کی گود میں آجاتا ہے کہ کھجور والی سرزمین کی پاسبانی سے لے کر زیتون والی ارض مقدس تک... فوج اور عوام دونوں... سیسہ پلائی دیوار بن جائیں۔

وفاق کے اکابرین سے انتہائی متاڈبانہ گزارش ہے خدارا! اس وقت مہاجرین کی نصرت سے زیادہ انصار کی حوصلہ افزائی کی ضرورت ہے۔ آپ ان لوگوں کے وارث ہیں جنہوں نے خلافت عثمانیہ کے لیے وہ کچھ کیا جس کے سہارے ہم آج تک سر اٹھا کر جی رہے ہیں۔ تاریخ آج دوبارہ آپ کو پکار رہی ہے۔ فقیر کے لکھے ہوئے تھوڑے کو بھی بہت سمجھیں اور عوام کو متوجہ کر کے ترک بھائیوں کی پشت پر کھڑا کریں۔ مسئلہ مہاجرین کے معاشی مسائل حل کرنے تک محدود نہ رکھا جائے، بلکہ وہ روحانی اور ایمانی کیفیت قوم میں پیدا کی جائے جن کے سہارے ہماری آیندہ نسلیں فخر کے احساس کے ساتھ جی سکیں۔ خلافت عثمانیہ کو ہم نے بندہ اور چندہ دونوں دیے تھے، آج اگر برادرانہ حمایت اور ایمانی اخوت کے دو بول ہی بول دیے جائیں تو جو قوم آج تک ہماری ماؤں بہنوں کے بھیجے گئے زیور کو نہیں بھولی وہ ہمارے علماء اور مشائخ کے اس کردار کو کیسے بھولے گی؟

اے فلاحی ادارو! تمہارے اولی الامر اور اہل تدبیر کہاں ہیں جو تاریخ کے اس نازک موڑ پر انمٹ سنہری تاریخ رقم کر سکتے ہیں۔ ہر طرح کی معلومات موجود اور ذرائع دستیاب ہو چکے ہیں۔ اللہ کی رضا و رحمت اور خلق خدا کی دعائیں اور لازوال محبت دونوں تمہارے لیے لکھی جاسکتی ہیں۔ اگر بدی کے کئی راستے چوپٹ کھلے ہیں تو نیکی کا راستہ بھی کہیں بند نہیں ہوتا۔ اور نیکی ایک بھی قبول ہو جائے تو شر کے اندر سے خیر نکال لاتی ہے۔ دشمن کے برپا کردہ اس شر سے کئی بھلائیاں وجود میں آسکتی ہیں۔ سنی سنائی نہیں مانی جاتی تو دیکھی دکھائی تو سن لو! ماضی کا کفارہ اور مستقبل کی نوید دونوں تمہارے انتظار میں ہیں۔ ارضِ خلافت سے لے کر ارضِ مقدس تک دونوں تمہاری راہ تک رہی ہیں۔

☆☆☆

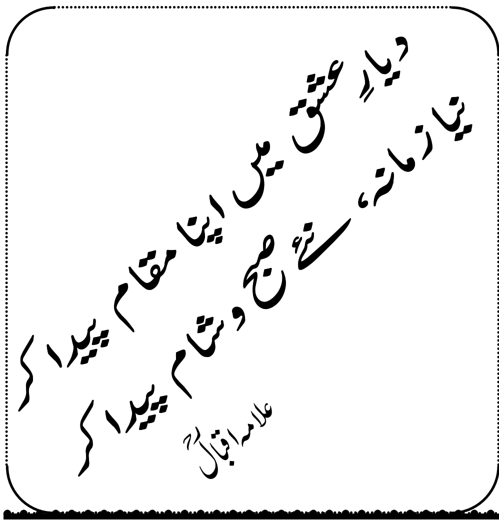

❑ پیامِ سیرت

''تو نہ روٹھے جو روٹھ جائے زمانہ سارا''

محمد فرید حبیب ندوی
Mob. 9012621589

''جو چیز میرے محبوب کو ناپسند ہو، اس کا میں یہی حشر کروں گا''

مجنونانہ و مجذوبانہ اور سرمستانہ کیفیت میں...... ہاتھ میں کدال اور دماغ میں بھونچال لیے...... وہ اپنے خوبصورت ترین مکان کو ڈھانے پر تلا ہوا تھا۔

وہ خوبصورت ترین مکان...... جو اس نے ابھی چند دنوں قبل ہی تعمیر کیا تھا۔

لوگ مبہوت و حیران تھے۔

ہر کوئی متعجب و ششدر تھا۔

آنے جانے والے اس کی یہ ''مجنونانہ حالت'' دیکھ رہے تھے۔

صورت حال سب کے لئے ہی ناقابل فہم تھی۔

وہ سراپا سوال تھے کہ اس ''مجنوں'' کو ہوا کیا ہے؟

یہ ''حرکت'' ہی ایسی تھی...... جسے کوئی بھی ہوشمندی سے تعبیر نہیں کر سکتا تھا۔

ایسا کام جو عقل و خرد رکھنے والا کوئی شخص کبھی نہ کرے۔

حیرانگی اس لئے اور بھی بڑھ گئی تھی کہ وہ کوئی عقل و خرد سے محروم نہ تھا۔

وہ تو تیز ترین دماغ، اعلیٰ ترین ذہانت کا مالک......اور......فہیم و فطین شخص تھا۔

سوسائٹی میں اس کا ایک وزن تھا......اس کی اپنی ایک شناخت تھی۔

یہ ناقابل فہم صورت حال اس لئے اور بھی پیچیدہ ہو گئی تھی کہ اس کا یہ محل علاقہ کا خوبصورت ترین محل تھا......آس پاس کا کوئی محل اس سے آنکھیں چار کرنے کے قابل نہ تھا......اور پھر اسے تعمیر کئے ہوئے ابھی دن ہی کتنے ہوئے تھے!!

گذرنے والے رک رک کر پوچھتے۔

سننے والے سنتے......تو آکر استفسار کرتے۔

صورتحال پیچیدہ سے پیچیدہ تر ہوتی جا رہی تھی۔

مگر......وہ سب سے بے نیاز ......سب سے بے پروا......اپنی دھن میں مست تھا۔

آخر جب پوری عمارت زمین بوس ہو گئی......تو اس کے لبوں میں جنبش ہوئی۔

اور اس نے کہانی کے سسپنس کو توڑ ہی دیا۔

اس کے اس جملہ نے مجمع پر چھائی خاموشی کو رفع کر دیا۔

بس ایک جملہ......اور حاضرین سب کچھ سمجھ گئے۔

وہ معاملہ کی تہہ تک پہنچ گئے......اور نہ صرف تہہ تک پہنچ گئے بلکہ اب وہ اس کو قابل رشک نظروں سے دیکھنے لگے۔

جو ابھی ان کے نزدیک قابل ترس اور موجب حیرت تھا......وہ اب کی آنکھوں کا تارا......اور نگاہوں کا مرکز بن گیا۔

اور بات تھی بھی کچھ ایسی ہی......۔

اس لئے کہ عمل کوئی بھی ہو......اس کی اہمیت اس کے پیچھے چھپے محرک سے ہوتی ہے۔

کتنے ہی اچھے عمل......محرک و جذبۂ عمل ...... کی وجہ سے ناپسندیدہ ...... نہ صرف ناپسندیدہ ...... بلکہ قابل نفرت اور قابل تحقیر بن جاتے ہیں۔

اور کتنے ہی ''بیہودہ عمل'' محرک وجذبہ کے سبب پاکیزہ ......اور نہ صرف پاکیزہ...... بلکہ قابل رشک اور قابل تقلید بن

جاتے ہیں۔

اور اس کا جذبہ بھی کچھ ایسا ہی تھا کہ...... جسے بھی پتہ چلا وہ رشک ہی کرتا چلا گیا۔

جس نے بھی سنا......سر دھنتا اور جھومتا چلا گیا۔

اُس جماعت کا ایک ایک فرد......اسی ''جذبہ'' سے سرشار تھا۔

یہ ''جذبہ'' ان کی رگوں میں خون کی طرح دوڑ تا تھا۔

یہ ''جذبہ'' ان کا جنون تھا......ان کا ایمان تھا......اور یہ ان کے لئے زندگی کا حاصل تھا۔

اسی کے لئے ان کا جینا تھا......اور اسی کے لئے ان کا مرنا۔

اس لئے ابھی جس شخص کا عمل ان کے لئے وجہ استفسار تھا......وہی اب ان کے لئے وجہ رشک بن چکا تھا۔

ان کی روح تو ان کے جسم میں تھی......مگر......جان ان کے محبوب میں تھی۔

وہ اپنا سب کچھ......اس کی ''خاک پا'' پر لٹا چکے تھے......ہاں ......سب کچھ ...... اپنے جذبات......اپنی خواہشات......اپنی تمنائیں......اپنی آرزوئیں......سب کچھ۔

اب وہ اسی کے تھے......صرف اسی کے۔

ان کی زندگی کا ریموٹ کنٹرول......اسی کے ہاتھ میں تھا۔

وہ بس اس کی رضا چاہتے تھے......اس کے دل میں تھوڑی سی جگہ پانے کی ان کی آرزو تھی۔

وہ اس کی خوشنودی کے لئے......اُس حد تک جا سکتے تھے، جس کا تصور بھی ہمارے ذہنوں کی رسائی سے دور ہے۔

اور وہ اس کی ناخوشی کے ڈر سے......''تاجِ سرِ دارا'' کو بھی ٹھوکر مار سکتے تھے۔

اس کی رضا کی خاطر جانوں کا نذرانہ پیش کر سکتے تھے۔

اور اس کی ناخوشی کے اندیشہ سے ''خزانہ قارون'' بھی ٹھکرا سکتے تھے۔

وہ بس اس کے غلام تھے......اس کے اشاروں کے غلام۔

اور یہی وصف ان کا سب سے امتیازی وصف تھا۔

اور اسی غلامی نے انہیں فرش سے عرش تک پہنچایا تھا۔

اور ''وہ'' بھی ان ہی میں سے ایک تھا۔

کچھ دیر قبل وہ مسجد رسول میں حاضر ہوا تھا......رحمت کونین کو عقیدت بھرے سلام کا نذرانہ پیش کیا مگر......مگر......اسے جواب نہ ملا۔

اس نے دوبارہ سلام کیا......مگر......اس بار بھی وہ جواب کے لئے ترس گیا۔

اس کا ''محبوب'' اس سے روٹھا ہوا تھا۔

اس نے اس سے نگاہیں پھیر لی تھیں۔

اور یہ......لمحہ اس کے لئے قیامت خیز تھا۔

اس کا پورا وجود لرز کے رہ گیا۔

بدن میں جھرجھری طاری ہوگئی۔

آنکھوں میں اندھیرا چھانے لگا۔

دل پر چھریاں چل گئیں......بدن سے گویا جان نکل گئی۔

اسے اپنا سارا وجود ملیامیٹ اور بھسم ہوتا دکھائی دیا......ساری زندگی رائیگاں ہوتی نظر آئی۔

دنیا بھی ہے......دولتِ دنیا بھی ہے......۔

عزت بھی ہے......وجہ عزت بھی ہے۔

شہرت بھی ہے......وجہ شہرت بھی ہے۔

لیکن......لیکن......اگر وہ نہیں......تو کچھ نہیں۔

ہاتھ کے کنگن اگر محبوب کو نہ بھائیں......تو کنگن نہیں......ہتھکڑیاں ہیں۔

سر کا تاج اگر اس کی آنکھوں کا کانٹا بن جائے......تو اس کی جگہ ''سر'' نہیں......قدموں کی ٹھوکر ہے۔

''سونے کا محل'' اگر اس کے دل کا داغ ثابت ہو......تو اس کا مقام فرش زمین نہیں......تہہ خاک ہے۔

یہ دولت، ...... یہ شہرت...... یہ عزت...... یہ کرسی...... یہ علم...... یہ عمل...... یہ حوالی موالی...... یہ نوکر چاکر...... یہ دنیا اور دنیا کی زیب و زینت......اگر اس سے دور کر دے......تو قدموں کی نوک......اور پاؤں کی ٹھوکر پر۔

وہ ناراض تو......زندگی بے جان۔

وہ روٹھا......تو......سب کچھ ختم۔

دل بیٹھنے لگا...... ہزاروں اندیشے تصور میں آنے لگے...... پردہ ذہن پر سب تصویریں ابھرنے لگیں......۔

کیا مجھ سے کوئی گناہ ہوا ہے...... کوئی گستاخی سرزد ہوئی ہے......میرا محبوب مجھ سے ناراض کیوں ہے؟

کوئی تو بتائے......آخر......ماجرا کیا ہے۔

وہ ایک ایک کا ہاتھ پکڑ کر پوچھتا......ایک ایک کا دامن تھام کر سوال کرتا۔

''کچھ بھی تو نہیں ہوا......ہمیں تو نہیں معلوم کہ تم سے کوئی گناہ ہوا ہو''......سب کی زبان پر ایک ہی جواب تھا۔

''وہ تو کسی سے بھی نہیں روٹھتے...... وہ تو سراپا رحمت ہیں......وہ روٹھے ہیں تو کوئی نہ کوئی بات تو ہے''......وہ سوچنے لگا۔

''اوہو......! یاد آیا......ابھی چند دن پہلے رسول اللہ ﷺ کا اس راستہ سے گذر ہوا تھا...... جہاں تمہارا مکان ہے......آپ نے پوچھا تھا کہ یہ مکان کس کا ہے......''

ذہن پر زور دیتے ہوئے ایک شخص نے عرض کیا۔

بس پھر کیا تھا ''مرد دانا'' سب کچھ سمجھ گیا۔

بھاگا بھاگا آیا...... کدال ہاتھ میں لی...... اور ''اس خوبصورت ترین محل'' کے پرخچے اڑا دیے۔

جسے ابھی بڑے پیار سے بنایا تھا......اسے اپنے ہی ہاتھوں سے اجاڑ دیا۔

اس لئے کہ......وہ سب کچھ سہہ سکتا تھا......مگر اپنے آقا کی خفگی نہیں۔

یہ رسول اللہ ﷺ کے ایک صحابی تھے......جن کا یہ واقعہ روایات میں ملتا ہے......لیکن نام کی صراحت نہیں......ان کا یہ جذبہ قابل دید ہے۔

مسئلہ جائز و ناجائز......حلال و حرام کا نہ تھا۔

بس اتنی سی بات تھی......کہ وہ اس کے محبوب کو نہ بھایا تھا۔

اس لئے کہ وہ اپنے صحابہ کو ''کسی اور ہی کام'' کے لئے تیار کر رہا تھا۔

ان کی طرف سے دنیاوی زیب و زینت کی طرف...... ہلکا سا میلان بھی اسے پسند نہ تھا۔

یہ واقعہ......سچا اور حقیقی واقعہ...... ہمارے مردہ دلوں اور مردہ ضمیروں کے لئے ایک تازیانہ ہے۔

اس میں مردہ قلوب کو زندہ کرنے کی تاثیر ہے۔

یہ ہمارے اعمال اور ہماری زندگی کے لئے ایک سوالیہ نشان ہے۔

اس واقعہ کو پڑھیں اور......حب دنیا میں مگن اپنی زندگی کا جائزہ لیں۔

اور دیکھیں کہ......ہم کس طرح مکروہات دنیا کے شکنجہ میں جکڑے ہوئے ہیں۔

اور خود سے سوال کریں......کیا ہم بھی ایمان کی اس اونچائی پر قائم ہیں یا نہیں؟

کیا ہمارے سینوں میں وہ جذبہ و جنون ہے کہ ہم ہر اس دولت کو لات مار دیں ......جو ہمیں ہمارے محبوب سے جدا کردے؟؟

ہر اس عہدے اور منصب کو ٹھکرا دیں...... جو ہمارے محبوب کی خوشی چھین لے؟؟

ہر اس تعلیم و تربیت کو نکار دیں......جو ہمیں ہمارے محبوب کی نگاہوں میں نیچا دکھا دے؟؟؟

ہر اس تہذیب و ثقافت پر لعنت بھیجیں......جو ہمیں ہمارے رسول کے نقوش قدم سے دور کردے؟؟

دنیا کی ہر اس بلندی سے دور بھاگیں...... جو ہمیں اس کی نگاہوں میں پست کردے؟؟

اگر ہاں ......تو زہے نصیب ......مبارک ......اور صد ہزار مبارک۔

اور اگر نہیں......تو ہمیں سنبھلنے، سدھرنے اور ایک نئی زندگی شروع کرنے کی ضرورت ہے۔

اور جب تک کرنے کی ضرورت ہے ...... جب تک ہمارا ایمان اِس جذبہ کی سچی تصویر نہ بن جائے......کہ:

''تو نہ روٹھے جو روٹھ جائے زمانہ سارا''

☆☆☆

□ خصائص و امتیازات

امتِ محمدیہ کے علماء کے امتیازات وخصوصیات

محمد قمرالزماں ندوی
جنرل سکریٹری: مولانا علاء الدین ایجوکیشنل سوسائٹی، جھارکھنڈ

علماء کرام امت محمدیہ کے خواص ہیں؛ کیوں کہ یہی انبیاء کرام کے حقیقی جانشین اور کار نبوت کے اصل ذمہ دار اور محافظ ہیں، معاشرہ کی اصلاح اور اس کو صحیح رخ پر قائم رکھنے کی ذمہ داری طبقۂ علماء پر رکھی گئی ہے، اگر علماء اس طرف توجہ نہ دیں گے تو پورا معاشرہ جہل وضلالت کی نذر ہوجائے گا اور حق اور باطل میں امتیاز کرنا مشکل ہوجائے گا، اسلام کی صحیح تصویر علماء ہی پیش کر سکتے ہیں، اس لئے کہ وہ وارثین انبیاء ہیں، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: إنما العلماء ورثة الانبياء وإن الانبياء لم يورثوا ديناراً ولا درهماً وإنما ورثوا العلم، فمن أخذ به فقد أخذ بحظ وافر (رواہ الترمذی)۔

’’علماء انبیاء کے وارث ہیں، انبیاء علیہم السلام نے علماء کو دینار ودرہم کا وارث نہیں بنایا، انہوں نے تو صرف علم کا وارث بنایا ہے، تو جس نے علم حاصل کیا اس نے (وراثتِ انبیاء کا) حصۂ وافر حاصل کرلیا۔‘‘

علماء کی فضیلت اور ہر دور میں ان کی ضرورت واہمیت سے کسی کو انکار نہیں ہوسکتا، اگر علماء نہ ہوں تو دین کے ایک مسئلہ پر عمل کرنا بھی دشوار ہوجائے۔ یہ امت بھی علماء سے بے نیاز نہیں ہوسکتی، کیوں کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں بطور خاص اپنے بندوں میں سے منتخب کرکے اپنی کتاب کا وارث بنایا ہے، قرآن میں اسی طبقہ کی طرف اشارہ ہے ’’ثم أورثنا الكتاب الذين اصطفينا من عبادنا (الفاطر ۳۱)‘‘ پھر ہم نے کتاب کا وارث ان لوگوں کو بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا۔ جیسا کہ اوپر حدیث میں یہ ذکر کیا گیا کہ علماء کو انبیاء کا وارث قرار دیا گیا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ وراثت مال و دولت اور زمین و جائداد کی وراثت نہیں ہے؛ بلکہ علوم نبوت کی وراثت ہے جو ہر شخص کو نہیں ملتی؛ بلکہ ان لوگوں کو عطا کی جاتی ہے جن کا مرتبہ اللہ تعالیٰ کے یہاں بے حد بلند ہوتا ہے۔

آپ ﷺ نے امت کے اس طبقۂ خواص کے بارے میں فرمایا: "إن الله وملائكته واهل السموات والأرضين حتى النملة فى جحرها وحتى الحوت يصلون على معلم الناس الخير" (ترمذی)۔

بیشک اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے، آسمان وزمین کی ساری مخلوق یہاں تک کہ چیونٹیاں اپنے بلوں میں اور مچھلیاں تک ایسے شخص کے حق میں دعا کرتی ہیں جو لوگوں کو اچھائی اور بھلائی کی باتیں سکھاتا ہے۔

حضرت فضیل بن عیاض فرماتے تھے: عالم عامل

معلم یدعیٰ کبیراً فی ملکوت السموات (ترمذی)
''عالم باعمل جولوگوں کوتعلیم دیتا ہومعلم ہو،ملأ اعلیٰ میں اس کے حق میں بڑی دعائیں کی جاتی ہیں''۔

طبرانی میں بروایت حضرتِ ثعلبہؓ یہ حدیث بیان کی گئی ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن علماء امت سے فرمائیں گے کہ میں نے تمہارے سینوں میں اپنا علم ومعرفت اسی لئے رکھا تھا کہ میرا ارادہ یہ تھا کہ تمہاری مغفرت کردوں خواہ تمہارے اعمال کیسے ہوں (بحوالہ تفسیر ابن کثیر)۔

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے ارشادفرمایا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اپنے سب بندوں کوجمع کریں گے۔ پھران میں سے علماء کوممتاز مقام پرجمع فرمائیں گے کہ میں نے اپنا علم تمہارے دلوں میں صرف اس لئے رکھا تھا کہ میں تم سے واقف تھا، میں نے اپنا علم اس لئے نہیں رکھا تھا کہ تمہیں عذاب دوں، جاؤ میں نے تمہاری مغفرت کردی۔(تفسیر طبری)۔

حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ امام محمدؒ کی وفات کے بعد کسی نے ان کوخواب میں دیکھا، پوچھا کہ آپ کے ساتھ کیا معاملہ ہوا، فرمایا جب میں دربار خداوندی میں حاضر ہوا تو مجھ سے فرمایا گیا: کیا مانگتے ہو؟ میں نے عرض کیا: اے اللہ میری مغفرت فرمادیجئے، فرمایا اے محمد! اگر ہمیں تم کو عذاب دینا ہوتا تو یہ علم عطا نہ کرتے۔ اسی سے بعض حضرات نے یہ استنباط کیا ہے کہ علماء کے علاوہ کسی کو یہ خبر نہیں کہ ہمارے ساتھ خدا کا کیا معاملہ ہوگا، کیوں کہ حدیث میں ہے کہ ''اللہ تعالیٰ جس کے ساتھ خیر کا معاملہ کرنا چاہتا ہے اسے دین کی سمجھ عطا کر دیتا ہے'' یعنی عالم بنا دیتا ہے۔ اس استدلال کے بعد حضرت تھانویؒ نے لکھا ہے کہ اب سمجھ میں آ گیا کتنی بڑی ضرورت اور کیسی فضیلت ہے علم دین کی کہ اللہ تعالیٰ بدون اس کے خوش نہیں ہو سکتے، رضائے حق علم دین حاصل کرنے پر موقوف ہے۔ (دعوات عبدیت، وعظ حق الاطاعہ صفحہ ۲۴)۔

لیکن یہاں یہ بات یادرہے کہ مذکورہ فضیلت امت محمدیہؐ کے ان علماء کے لئے ہے جن کے اندرخوفِ خدا ہواور وہ عالم باعمل ہوں، اسی لئے سورہ فاطر میں فرمایا گیا ہے "إنما یخشی اللہ من عبادہ العلماء" (اللہ سے اس کے بندوں میں صرف علماء ڈرتے ہیں) لفظ "إنما" کی وجہ سے بظاہر آیت کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ اللہ سے صرف علماء ہی ڈرتے ہیں دوسرے نہیں ڈرتے، مگر مفسرین لکھتے ہیں کہ "إنما" صرف حصر کے لئے ہی نہیں آتا بلکہ کسی چیز کی خصوصیت بیان کرنے کے لئے بھی آتا ہے، اور یہاں مراد ہے کہ خوفِ خدا علماء کا ایک خاص وصف ہے، اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ غیر علماء میں خوفِ خدا نہیں ہوتا، اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ بہت سی احادیث یاد کر لینے کا نام علم نہیں ہے؛ بلکہ علم وہ ہے جس کے ساتھ اللہ کا خوف بھی ہو۔ حضرت ربیع ابن انس فرماتے ہیں کہ جس میں خوف خدا نہیں وہ عالم نہیں۔ الغرض حقیقی عالم وہی ہے جس کے اندر خوف خدا ہو اور اس کا علم عمل کے ساتھ ہو۔ یہی وہ علماء ہیں جو وارثین انبیاء ہیں اور زمین کے چراغ ہیں اور روئے زمین میں اللہ کے امین ہیں۔

حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ نے علماءِ امت محمدیہ کے خصائص وامتیازات پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ''منجملہ معجزات کے اس امت کے علماء وصلحاء آپؐ کی نبوت ورسالت

کا معجزہ ہیں کہ حق جل شانہ نے آپ کی امت کو خیر الأمم بنایا اور علماء کو انبیاء کرام کا وارث بنایا۔ اور ایسا بے مثال حافظہ اور بے نظیر علم وفہم عطا کیا کہ اولین وآخرین میں اس کی نظیر نہیں، حضراتِ محدثین کو قوتِ حافظہ میں کراماً کاتبین کا نمونہ بنایا اور حضراتِ فقہاء کو قوتِ اجتہاد واستنباط عطا کی اور فہم وادراک و نکتہ سنجی و دقیقہ رسی میں ملائکہ مقربین کا نمونہ بنایا، اور اولیاء عارفین کو اپنے عشق اور محبت کی دولت سے نوازا اور عرشِ عظیم اور بیت معمور کا لیل ونہار طواف کرنے والے فرشتوں کا نمونہ بنایا، کسی امت میں علماء اسلام جیسا علم اور فہم اور تحقیق وتدقیق کا نام ونشان نہ ملے گا، اور نہ ان کی بے مثال اور بلند پایہ تصانیف کی کوئی نظیر نظر آئے گی۔

مغربی اقوام نے صنعت اور کاریگری میں حیرت انگیز کرشمے دکھائے، مگر ان قوموں میں توریت اور انجیل کا نہ کوئی بخاری اور مسلم نظر آتا ہے کہ جس کو توریت وانجیل ازبر ہو اور نہ یحیی بن سعید القطان اور یحیی بن معین جیسا اسماء الرجال کا حافظ وعالم پیدا ہوا۔ جن قوموں نے اپنے پیغمبروں کی کتابوں اور صحیفوں میں دیدہ ودانستہ تحریف کرڈالی ہو، ایسی قوموں میں احمد بن حنبل اور یحیی بن معین جیسا حافظ حدیث ہونا ناممکن اور محال ہے اور نہ یہود اور نصاری کی اولین وآخرین میں ابوحنیفہ اور شافعی جیسا فقیہ اور مجتہد نظر آتا ہے کہ جو دین و دنیا اور اعتقادات اور عبادات و معاملات اور معاشرت اور سیاست ملکیہ و مدنیہ کے تمام مسائل کو توریت وانجیل کی روشنی میں حل کر سکے۔ اور نہ ابوالحسن اشعری اور ابومنصور ماتریدی اور غزالی اور رازی جیسا کوئی متکلم کسی امت میں نظر آتا ہے کہ جب میدانِ مباحثہ ومناظرہ میں نکلے تو عقائد اسلامیہ کی تحقیق کے لئے عقلی ونقلی دلائل کا لشکر اس کے ساتھ ہو اور باطل کی گردن پر اس کی تیغ بے دریغ چل رہی ہو اور دنیا اسلام کی سرفرازی اور سربلندی اور کفر و باطل کی ذلت وخواری اور سرنگوئی کا تماشہ دیکھ رہی ہو، اور نہ جنید وشبلی اور بایزید اور معروف کرخی جیسا عابد و زاہد اور خداوند ذوالجلال کا عاشق اور مجنوں کسی امت میں پیدا ہوا۔ اور نہ خلیل بن احمد اور سیبویہ جیسا علم اعراب کا موجد وامام کسی ملت میں ہوا، اور نہ عبدالقاہر جرجانی اور سعد الدین تفتازانی جیسا اسرارِ بلاغت اور دلائل اعجاز کا امام کسی امت میں پیدا ہوا۔ علماء یہود و نصاریٰ عبرانی یا سریانی یا انگریزی زبان کی لغت میں کوئی لسان العرب اور القاموس اور تاج العروس دکھلائیں، جمال الدین ابن حاجب اور جامی کا تو ذکر کیا کروں، میزان ومنشعب اور صرف میر ونحو میر جو علم صرف ونحو کی بالکل ابتدائی کتابیں ہیں، علماءِ یہود و نصاری عبرانی وسریانی یا انگریزی زبان کے متعلق کوئی ان جیسی میزان ومنشعب تو دکھلائیں، بطور نمونہ ان چند علوم کا ذکر کر دیا آگے قیاس کرلو۔ یہود ونصاریٰ سے ہمارا مطالبہ ہے کہ علماء اسلام کا شریعت موسویہ اور شریعت عیسویہ کے علماء اور فضلاء سے موازنہ کرکے دیکھو، صنعتی اور حرفتی ترقی پر نظر نہ کرو، یہ علمی اور اخلاقی ترقی نہیں؛ بلکہ یہ کاری گری ہے، اس میں دن بدن اور ترقی ہوگی اور ظاہر ہے کہ اسلام میں یہ علمی اور عملی اور اخلاقی ترقی سب آنحضرت ﷺ کی شریعت کی اتباع کی برکت سے ہوئی، علم وحکمت کے دروازے کھل گئے اور امتِ محمدیہ میں ایسے بے مثال علماء فضلاء اور اولیاء اور اتقیاء پیدا ہوئے کہ کسی امت میں ان کی نظیر نہیں۔ (سیرۃ المصطفی جلد سوم صفحہ ۴۵۰-۴۵۲)۔

☆☆☆

❑ اسلامی تعلیمات

قضائے حاجت کا اسلامی طریقہ - حکمتیں اور مصلحتیں

محمد تبریز عالم حلیمی قاسمی، استاد: دارالعلوم حیدرآباد
E-mail: mtalam800@gmail.com

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء جانے کا ارادہ فرماتے تھے تو (یہ دعا) پڑھتے تھے:

اَللّٰھُمَّ إِنِّي أَعُوْذُ بِکَ مِنَ الْخُبُثِ وَالْخَبَائِثِ

(ایک روایت میں بسم اللہ کا تذکرہ ہے؛ اِس لیے مذکورہ دعا کے شروع میں بسم اللہ پڑھنا چاہیے)

ترجمہ: اے اللہ! میں تیری پناہ چاہتا ہوں خبیثوں سے اور خبیثیوں سے۔(مسلم، رقم:۳۷۵-ترمذی، رقم:۶۰۶)۔

تشـــــریـــح: قضائے حاجت انسان کی فطری ضرورت ہے، بیدار ہونے کے بعد عام طور سے انسان کو اپنی حاجت پوری کرنے کے لیے بیت الخلاء جانے کی ضرورت پڑتی ہے، اِس ضرورت کو کیسے پورا کیا جائے، اسلام میں اِس کی مکمل رہنمائی موجود ہے، ابوداوٗدؒ نے اپنی حدیث کی کتاب سنن ابی داوٗد میں تقریباً پچیس ابواب منعقد فرمائے ہیں اور اِن سب میں آدابِ خلاء یعنی پیشاب و پاخانہ کے طور طریقہ بیان کیے ہیں، ہماری شریعت کتنی جامع اور مکمل شریعت ہے کہ اِس میں استنجاء جیسی معمولی چیز کے لیے اِس قدر آداب ہیں اور اِسی لیے اسلام کو دینِ فطرت بھی کہتے ہیں، حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ (بعض مشرکین کی طرف سے استہزاء اور طنز کے طور پر) اُن سے کہا گیا کہ تمھارے پیغمبر نے تم لوگوں کو ساری ہی باتیں سکھائی ہیں، یہاں تک کہ پاخانہ کرنے کا طریقہ بھی؟ حضرت سلمان فارسیؓ نے اُن سے کہا :ہاں! بے شک انھوں نے ہمیں منع فرمایا ہے کہ پاخانہ و پیشاب کے وقت ہم قبلہ کی طرف رخ کریں یا یہ کہ ہم داہنے ہاتھ سے استنجاء کریں یا یہ کہ ہم استنجے میں تین پتھروں سے کم استعمال کریں یا یہ کہ ہم کسی چوپائے کے گوبر اور لید یا ہڈی سے استنجاء کریں -(مسلم، رقم الحدیث: ۲۶۲، کتاب الطھارۃ)- حضرت سلمانؓ کے جواب کا مطلب یہ تھا کہ یہ کوئی قابل استہزاء بات نہیں ہے؛ بلکہ یہ اِس مذہب کی جامعیت کی دلیل ہے، اور بلا شبہ وہ خاص وقت ایسا ہوتا ہے کہ اُس وقت اللہ کا نام لینا اور اُس سے دعا کرنا بے ادبی کی بات ہوگی، اِس لیے رسول اللہ ﷺ نے ہدایت فرمائی کہ جب کوئی بندہ قضائے حاجت کو جائے تو مشغول ہونے سے پہلے مذکورہ دعا پڑھے۔

چند مسائل:

۱- بیت الخلاء جاتے وقت اور نکلتے وقت حدیثوں میں جو دعائیں آئی ہیں وہ باہر پڑھ کر بیت الخلاء میں جانا چاہیے اور بعد کی دعا باہر نکل کر پڑھنی چاہیے اور کھلی جگہ مثلا: جنگل وغیرہ میں قضائے حاجت کے لیے جائیں تو ستر کھولنے سے پہلے اور

ستر ڈھانکنے کے بعد پڑھنی چاہییں۔

۲- اگر کوئی شخص باہر دعا پڑھنا بھول جائے اور اندر جانے کے بعد یاد آئے تو اگر بیت الخلاء صاف ستھرا ہے جیسے فلش: جہاں بالفعل گندگی نہیں ہوتی تو وہ جنگل کے حکم میں ہے، ستر کھولنے سے پہلے دعا پڑھ سکتا ہے اور بعد کی دعا باہر نکل کر پڑھنی چاہیے؛ کیوں کہ استنجے کے بعد بیت الخلاء میں بدبو ہوگی۔

۳- اگر بیت الخلاء میں بالفعل گندگی ہو یا صفائی نہ ہونے کی وجہ سے بدبو ہو تو دعا دل میں پڑھے، زبان سے نہ پڑھے؛ کیوں کہ گندگی اور بدبو کے قریب اللہ کا ذکر کرنا مکروہ ہے۔

۴- ایسا واش روم جس میں کموڈ، واش بیسن اور غسل ٹب ایک جگہ پر ہوں تو یہ بیت الخلاء کے حکم میں ہے، ایسے واش روم میں داخل ہونے سے پہلے دعا پڑھنی چاہیے اور قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد اگر وضو کرنا ہے تو وضو کی ابتداء اور درمیان کی دعائیں دل میں پڑھیں، زبان سے کچھ نہ پڑھیں اور باہر نکل کر بیت الخلاء سے نکلنے اور وضو کے بعد کی دعائیں پڑھیں؛ البتہ اگر واش روم میں ڈھکن والا کموڈ لگا ہوا ہے اور وہ بند بھی ہے اور صفائی کا بھی خوب اہتمام کیا ہوا ہو تو پھر بوقتِ وضو دعائیں زبان سے پڑھ سکتے ہیں۔

۵- قضائے حاجت کے وقت اِس طرح بیٹھنا چاہیے کہ قبلے کی طرف نہ منھ ہو اور نہ پیٹھ، ورنہ قبلہ کا تقدس پامال ہوگا۔

۶- استنجے کی جو دعائیں منقول ہیں وہ چھوٹے بڑے دونوں استنجوں کے لیے عام ہیں، لوگ بڑے استنجے میں اُن کا اِہتمام کرتے ہیں؛ مگر چھوٹے استنجے کے وقت اُن دعاؤں کا اہتمام نہیں کرتے یہ ٹھیک نہیں؛ بلکہ دونوں صورت میں پڑھنا چاہیے؛ کیوں کہ ستر دونوں استنجوں میں کھلتا ہے۔

بیت الخلاء کی دعا کی حکمت اور پیغام:

۱- جنات ہم کو دیکھتے ہیں اگر چہ ہم اُن کو نہیں دیکھتے اور جب شرارت کا کوئی موقع آتا ہے تو اس کو شیاطین ہاتھ سے نہیں جانے دیتے، اُن کی شرارت سے بچنے کے لیے یہ دعا تلقین کی گئی، ایک حدیث (ترمذی، رقم:۶۰۶) میں ہے کہ جب انسان بسم اللہ پڑھ کر بیت الخلاء میں جاتا ہے تو شیاطین کو انسان کی شرم گاہ نظر نہیں آتی؛ اِس لیے ان کے لیے کھلواڑ کرنا ممکن نہیں ہوتا؛ اِس لیے بہتر ہے کہ قضائے حاجت کے لیے جانے والا یوں دعا پڑھے۔

بسم اللہ اللھم إنّي أَعُوْذُ بِكَ مِنَ الخُبُثِ والخَبَائِثِ. (تحفۃ الالمعی:۱/۲۰۱-الاذکار:۱/۲۵، شاملہ)

۲- جس طرح مکھیاں اور دوسرے غلاظت پسند کیڑے مکوڑے غلاظت پر گرتے ہیں اِسی طرح خبیث شیاطین اور بعض دوسری موذی مخلوقات غلاظت کے مقامات سے خاص دلچسپی اور مناسبت رکھتے ہیں؛ اِس لیے رسول اللہ ﷺ نے اِن مقامات میں جانے کے وقت کے لیے یہ دعا فرمائی، اور خود رسول اللہ ﷺ کا معمول بھی تھا کہ بیت الخلاء جانے کے وقت دعا کرتے۔(معارف الحدیث:۵/۱۳۲)۔

۳- روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شیاطین جسمانی طور پر بھی انسان کو نقصان پہنچا سکتے ہیں اور روحانی طور پر بھی، جسمانی نقصان یہ پہنچا سکتے ہیں کہ تمھیں ظاہری گندگی میں ملوث کردیں اور اس کے نتیجے میں تمھارے کپڑے اور جسم ناپاک ہوجائیں، اور بعض اوقات جسمانی بیماری میں مبتلا کردیتے ہیں؛ چناں چہ تاریخ میں بعض ایسے واقعات پیش آئے ہیں کہ شیاطین نے اُن گندے مقامات پر باقاعدہ کسی انسان پر حملہ کیا اور بالآخر اُس کو موت کے منھ میں پہنچا دیا، بعض علماء نے یہ بھی فرمایا ہے کہ بیماری کے جراثیم شیاطین ہی کا ایک حصہ ہوتے ہیں؛ لہٰذا اِن مقامات پر انسان کی صحت کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔

روحانی نقصان یہ ہے کہ اِن مقامات پر انسان کی شرم گاہ کھلی ہوتی ہے، اُس وقت شیطان انسان کے دل میں فاسد خیالات پیدا کرتا ہے، غلط قسم کے خیالات، خواہشات اور غلط قسم کی آرزوئیں پیدا کرتا ہے جس کی وجہ سے انسان کے سفلی جذبات، سفلی خواہشات زیادہ زور دکھاتے ہیں، اگر اللہ کی پناہ شاملِ حال نہ ہو تو انسان ان مقامات پر گناہوں کا بھی ارتکاب کر لیتا ہے۔(اسلام اور ہماری زندگی:۱۰/۹۵)۔

۴- ایک کامل مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ اس کی زبان ہر وقت ذکر الٰہی میں مشغول رہے؛ لیکن نجاست اور گندگی کی جگہ میں ذکر کرنا بے ادبی اور بے احترامی کی بات ہوگی، معلوم ہوا کہ بیت الخلاء میں جا کر ذکر اللہ میں اِنقطاع پیدا ہوگا؛ اِس لیے اِس موقع پر دعا پڑھنے کی تعلیم دی گئی؛ تا کہ مسلمان کا رابطہ اللہ رب العزت سے جڑا رہے، اب ظاہر ہے کہ انسان اگر اِس حالت میں بھی اللہ کے ساتھ رابطہ قائم رکھے تو یقیناً وہ وہاں پر گناہوں سے محفوظ رہے گا، اور اگر اِس طرح پوری زندگی میں اِس کا خیال رکھے گا تو اُس کی زندگی سنت وشریعت کے عین مطابق ہوگی، اس کی دنیا وآخرت سنور جائے گی۔(مرقاۃ المفاتیح:۱/۳۷۵ شاملہ)۔

۵- ذکرُ اللہ، شیاطین سے بچنے کا ذریعہ ہے جس قلب میں اللہ کا ذکر سما جائے گا وہاں پر شیاطین کا تصرف زیادہ نہیں ہوگا، ترمذی شریف کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کی مثال ایک محفوظ ومضبوط قلعہ کی سی ہے جس طرح آدمی دشمنوں اور ڈاکوؤں کے تعاقب سے ایک مضبوط قلعہ کے ذریعہ سے بسہولت بچ سکتا ہے اسی طرح شیاطین کے اثرات سے ذکر کے ذریعہ ہی بچ سکتا ہے؛ ورنہ یہ کسی کو بخشتے نہیں۔(الدر المنضود:۱/۹۱)۔

۶- بیت الخلا جانا ہماری مجبوری ہے، اللہ تعالیٰ اِس موقع پر بھی ہماری آزمائش فرماتے ہیں کہ ہم اللہ کو یاد رکھتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں۔

لمحۂ فکریہ:

اِس ترقی یافتہ دور میں مکانات اور بلڈنگیں نہایت عمدہ، خوب صورت بن رہی ہیں، مکانات کی زینت، نقاشی، رنگ وروغن پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں، بیت الخلاؤں اور ٹوائیلٹس کو بھی صاف ستھرا اور عمدہ بنایا جا رہا ہے، اسلام اِس سے منع نہیں کرتا؛ لیکن تعمیر وترقی کے اِس دور میں مسلمانوں کی زندگیوں سے مذکورہ دعا غائب ہوگئی، نوجوانوں اور عورتوں کا بہت بڑا طبقہ اِس دعا سے غافل ہے، ضرورت اِس بات کی ہے کہ ہم تمام مسلمان اِس دعا کا اہتمام کریں اور دعا پڑھتے وقت اِس دعا کی حکمت اور پیغام کو ذہنوں میں مستحضر رکھیں، زندگی سکون سے گذرے گی؛ کیوں کہ اصل سکون واطمینان اللہ کے ذکر اور رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کی پیروی میں مضمر ہے، اگر دعا یاد نہیں تو بیت الخلاؤں کے دروازوں پر لکھ کر چپکا دیں؛ تا کہ بیت الخلاء جاتے وقت دعا یاد آجائے، ایک گمنام اقتباس پڑھیے:-

آج کی دنیا میں جس کو دیکھو مسائل کا شکار ہے جانی، سماجی یا معاشی پریشانی کا شکار ہے، سکون نام کی چیز ہماری زندگی سے نہ جانے کہاں کھوگئی، وجہ کیا ہے آخر کہ ہم جو نبی کریم ﷺ کے امتی ہیں، اتنے مصائب میں گھرے ہوئے ہیں، ذرا سا غور کریں تو وجہ بالکل سامنے ہی ہے، ہمارے نبی ﷺ نے ہمیں زندگی گذارنے کا ایک ڈھنگ دیا ہے، ایک طریقہ دیا ہے، ہم اگر زندگی کے ہر قدم پر نبی کریم ﷺ کی سنتوں کا اہتمام کریں تو بڑی بڑی پریشانیوں سے بچ سکتے ہیں......انسان کی ۹۰ فیصد

روحانی اور ۵۰ فیصد جسمانی بیماریوں کا تعلق صرف بیت الخلاء یعنی واش روم سے ہے، ایک چھوٹی سی دعا کو چھوڑا اور کتنی بیماریوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا، جراثیم، جرم تھیوری وغیرہ یہ سب شیطان کے ہی نظام ہیں، ہر گندی جگہ زیادہ جراثیم ہوتے ہیں، جنات اور شیاطین وہاں رہتے ہیں، اب چاہے اس بیت الخلاء کو آپ جتنا سجا لو یہ ظاہری نظام ہی ہے، اس کے لیے نبی کریم ﷺ کی دی ہوئی دعا کو پڑھ کر جانے میں ہی عافیت ہے، بیت الخلاء جانا ہماری مجبوری ہے؛ مگر اللہ جل شانہ اِس موقع پر بھی ہماری ذمہ داری لیتے ہیں۔

أعوذ بك کا مطلب ہے پناہ میں آتا ہوں یعنی اللہ کے سپرد اپنے آپ کو کرتا ہوں، اب جب بندہ اللہ کے سپرد اپنے آپ کو کردے تو اللہ پاک سے بڑا محافظ بھلا کون ہے؟ ہم نے بیت الخلاء کو ٹائلوں سے مزین کرلیا اور پہلو میں سجا لیا اور بے فکر ہوگئے، یہاں کچھ لوگوں نے تو مغرب کی اندھی تقلید میں بیت الخلاء کو آرام گاہ بناڈالا، جتنے نفسیاتی امراض کے مریض مغربی ممالک میں ہیں اور کہیں نہیں۔ اللہ تعالیٰ ہم تمام مسلمانوں کو اِس دعا کو حسبِ موقع پڑھنے اور سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

بیت الخلاء سے باھر نکلنے کی دعا:

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب بیت الخلاء سے باہر نکلتے تو یہ دعا پڑھتے۔

غُفْرَانَكَ اے اللہ میں تیری مغفرت چاہتا ہوں۔ (ترمذی، رقم: ۷)۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ بیت الخلاء سے باہر تشریف لاتے تو (ترمذی کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آں جناب ﷺ بیت الخلاء سے نکلتے وقت "غفرانك" پڑھتے تھے، اور ابن ماجہ وغیرہ کی روایتوں میں الحمد لله الذي أذهب عني الأذى وعافاني کے الفاظ آئے ہیں، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ کبھی آپ ﷺ پہلی دعا پڑھتے تھے اور کبھی دوسری، محدثین لکھتے ہیں کہ دونوں کو جمع کرلینا بہتر ہے، اِسی لیے دعاؤں کی اردوں کتابوں میں یہ دعا ایک ساتھ لکھی ہوئی ہے یعنی غفرانك الحمد لله الذي أذهب عني الأذى وعافاني) یہ دعا پڑھتے تھے۔

الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ أَذْهَبَ عَنِّيْ الأَذَى وَعَافَانِي. (ابن ماجہ، رقم: ۳۰۱)

ترجمہ: حمد وشکر اُس اللہ کے لیے جس نے میرے اندر سے گندگی اور تکلیف والی چیز دور فرمادی اور مجھے عافیت وراحت دی۔

تشریح: انسان جب فراغت کے بعد بیت الخلاء سے باہر نکلنے کا ارداہ کرے تو اُس وقت سرکارِ دو عالم ﷺ نے دوسری دعا تلقین فرمائی اور دوسرا ادب بتایا ہے کہ جب باہر نکلنے لگو تو پہلے دایاں پاؤں باہر نکالو اور مذکورہ دعا پڑھو: اِس موقع پر دعا پڑھنے کی تلقین درحقیقت یہ بتانا ہے کہ انسان کے لئے ہمیشہ اپنے رب اور خالق ومالک کو یاد رکھنا نہ صرف ضروری ہے بلکہ اس کی تخلیق کا مقصد بھی ہے، آخر انسان؛ بالخصوص مسلمانوں میں اور جانوروں میں کچھ تو مابہ الامتیاز ہونا چاہیے، مذکورہ موقع پر دعا اسلام کی جامعیت اور اس کے سراپا مہذب مذہب ہونے کی واضح دلیل ہے، کیا کوئی اور مذہب بھی ہے جس میں ایسی جامع تعلیمات وتہذیب کی تلقین ہو۔

مذکورہ دعا کی حکمت اور پیغام:

(۱) دعا کا آغاز غفرانك سے ہو رہا ہے جس کا مطلب ہے اے پروردگار عالم میں آپ سے مغفرت اور بخشش مانگتا ہوں، فطری طور سے یہ سوال پیدا ہوگا کہ اِس موقع بظاہر کسی

گناہ کا ارتکاب تو نہیں ہوا ہے، پھر کس چیز سے مغفرت مانگتا ہوں، علماء وفقہاء نے اِس کے مختلف جوابات لکھے ہیں، آپ بھی پڑھیں، ایمان میں اضافہ ہوگا۔

۱- اِس موقع پر دو باتوں سے مغفرت مانگی گئی ہے: ایک اِس بات سے کہ اِس وقت میں جس حالت میں تھا، ہوسکتا ہے کہ مجھ سے کوئی غلط عمل سرزد ہوگیا ہو، اُس سے مغفرت مانگتا ہوں، دوسری بات یہ کہ اے اللہ! آپ نے اپنے فضل وکرم سے مجھ پر جتنے انعامات فرمائے ہیں، میں اُن انعامات پر شکر کا حق ادا نہیں کرپایا: اب ایک نعمت اور مجھے حاصل ہوگئی ہے؛ کیوں کہ جسم سے نجاست کا نکل جانا یہ اللہ تعالیٰ کا اتنا بڑا انعام ہے کہ انسان کی زندگی کا دارومدار اِس پر ہے، اب اِس وقت اے اللہ! آپ نے جو یہ نعمت عطا فرمائی ہے، میں اس نعمت کے شکر کا حق ادا نہیں کرسکتا، اِس پر میں آپ سے پہلے ہی مغفرت مانگتا ہوں۔(اسلام اور ہماری زندگی:۹۶/۱۰)۔

۲- حضورﷺ ہر وقت ذکر فرماتے رہتے تھے؛ لیکن بیت الخلاء میں ذکرِ لسانی کا سلسلہ منقطع رہتا تھا، اِس انقطاعِ ذکرِ لسانی پر آپ نے استغفار فرمایا (ہم ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول نہیں رہتے، یہ ہماری کوتاہی شمار ہوگی، گویا اِس دعا میں ایک پیغام یہ بھی ہے کہ ہمیں ہر وقت ذکرِ الٰہی میں مشغول رہنا چاہیے اور بیت الخلاء میں انقطاعِ ذکر لسانی پر معافی مانگنی چاہیے، سرکارِ دوعالمﷺ کی پیروی ہی کامیابی وکامرانی اور اسلامی زندگی کی فلاح وبہبود کی کنجی ہے)۔

۳- ایک جواب حضرت گنگوہی (م:۱۳۲۳ھ) نے یہ دیا ہے کہ قضائے حاجت کے وقت انسان اپنی نجاستوں کا مشاہدہ کرتا ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اُن ظاہری نجاستوں کو دیکھ کر انسان کو اپنی باطنی نجاستوں (نجاست قلبیہ یعنی گناہ) کا استحضار کرنا چاہیے اور ظاہر ہے کہ یہ استحضار، استغفار کا مُوجِب ہوگا؛ اِس لیے "غفرانك" کہنے کی تعلیم دی گئی۔(درس ترمذی:۱۸۰/۱)۔

۴- قضائے حاجت سے فراغ کا وقت نعمتِ غذا کی تکمیل کا وقت ہے، اول اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے کی نعمت عطا فرمائی، پھر اُس کو سہولت کے ساتھ حلق سے نیچے اتارا، ورنہ بعض مرتبہ پھندہ بھی لگ جاتا ہے، پھر اس کے بعد معدہ کا اس غذا کو قبول کرنا اور اُس کا ہضم ہونا اور ہضم ہونے کے بعد کارآمد اجزاء کا جُزِ وبدن بننا اور سب سے اخیر میں فُضلہ کا عافیت کے ساتھ جسم کے اندر سے باہر آجانا جو آخری مرحلہ ہے؛ غرضیکہ یہ نعمتِ غذا کی تکمیل کا وقت ہے جس کا حق اور شکر ہم سے ادا نہیں ہوسکتا، اِس تقصیر (کوتاہی) پر آپ نے امت کو استغفار کی تعلیم فرمائی (بندہ اپنے آپ کو عاجز اور لاچار سمجھ کر خدا تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے، یہ اعترافِ تقصیر کہلاتا ہے اور اعترافِ تقصیر، اللہ کے نزدیک شکر کی حقیقت ہے، اعترافِ عجز عن الشکر، شکر کہلاتا ہے)(الدر المنضود:۱۳۰/۱، مرقاۃ المفاتیح:۳۸۷/۱)۔

۵- اللہ کی نعمتیں بندے پر ہر وقت برستی ہیں، ان نعمتوں کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہے، ایک لمحہ بھی غافل نہ ہو اور قضائے حاجت انسان کی مجبوری ہے وہ اس وقت میں ذکر نہیں کرسکتا اس کوتاہی پر- اگرچہ وہ بدرجۂ مجبوری ہے- غفرانك کے ذریعہ معافی مانگی گئی ہے، بندہ عرض کرتا ہے: خدایا! جو غفلت میری طرف سے پائی گئی اس کوتاہی کا میں معترف ہوں اور بخشش طلب کرتا ہوں، مجھے معاف فرما۔(تحفۃ الالمعی:۲۰۴/۱)۔

۵- چوں کہ یہ وقت اور ہیئت وحالت شیطان کے تَلَعُّب، معیت اور تلوُّث کی ہے؛ لہٰذا اس کے مقابلہ میں طلبِ مغفرت کو ضروری قرار دیا گیا۔

۷- طلبِ مغفرت کے لیے پہلے گناہ کا ہونا ضروری نہیں ہے؛ بلکہ جس طرح نیکی کی نورانیت قلب پر اثر کرتی ہے اسی طرح گناہ کا میل اور کدورت بھی قلب پر اثر کرتی ہے، طلبِ مغفرت سے غرض یہ ہے کہ جو کدورت اور میل گناہ کی وجہ سے قلب پر جم گئی ہے اس کا ازالہ کیا جائے......لہٰذا قضائے حاجت کی وجہ سے ذکر سے محرومی کا جرم غیر اختیاری ہونے کے سبب یقیناً معاف ہے؛ لیکن اس کی وجہ سے روحانی ترقی میں جو کمزوری، سستی اور پیچھے رہ جانا ہوا ہے، طلبِ مغفرت سے اس کا ازالہ مقصود ہے۔(حقائق السنن:۱/۱۴۲)۔

۸- انبیاء کے علاوہ کوئی فرد یا جماعت گناہوں سے محفوظ نہیں ہے، موجودہ دور، دین سے دور اور اسلامی تہذیب واخلاق سے عاری ہے، اِس دور میں تو گناہوں کی کثرت ہے، سرکارِ دو عالم ﷺ نے قضائے حاجت کے بعد مذکورہ مغفرت کے ذریعہ اپنی امت کو یہ تعلیم دی کہ تمھارا نبی گناہوں سے پاک صاف ہے، اس کے اگلے اور پچھلے سارے گناہوں کی بخشش کا اعلان ہو چکا ہے، تب بھی وہ مغفرت الٰہی کا طالب ہے، تو تمھیں طلبِ مغفرت کی کتنی ضرورت ہونی چاہیے، تم تو گناہوں کے پتلے ہو، تمھارا نبی ایک ایسی جگہ مغفرت کا طالب ہے جہاں کسی طرح کا کوئی گناہ نہیں ہوا ہے اور جہاں قضائے حاجت کے لیے جانا ایک فطری مجبوری ہے؛ لہٰذا تمھیں تو یہ عملِ نبوی اپنی زندگی میں لا کر یہ عہد کرنا چاہیے کہ ہم پوری زندگی گناہوں سے دور رہیں گے اور اگر کبھی گناہ ہو گیا تو فوراً مغفرت کی درخواست کریں گے؛ اِسی لیے آپ ﷺ مختلف اوقات اور مختلف اعمال کے اخیر میں استغفار پڑھا کرتے تھے؛ تاکہ جہاں ایک طرف اپنی کوتاہی اور عاجزی کا اعتراف ہو سکے جو شکر کا لازمی حصہ ہے، وہیں دوسری طرف امت بھی طلبِ مغفرت کی عادی ہو جائے اور یہی چیز انسان کی ترقیٔ درجات کا سبب ہے، اللہ ہمیں اِس کی توفیق دے۔

دوسری دعا کی حکمت اور پیغام:

۱- مولانا منظور نعمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں:

پیشاب یا پاخانہ خدانخواستہ رک جائے اور فطری طریقہ سے خارج نہ ہو تو اللہ کی پناہ! کیسی تکلیف ہوتی ہے اور اس کے خارج کرنے کے لیے اسپتالوں میں کیا کیا تدبیریں کی جاتی ہیں، اگر بندہ اس کا دھیان کرے تو محسوس کرے گا کہ فطری طریقے سے پیشاب یا پاخانہ کا خارج ہونا اللہ تعالیٰ کی کتنی بڑی نعمت اور کتنا عظیم احسان ہے، رسول اللہ ﷺ اسی احساس اور دھیان کے تحت اس موقع پر اِس کلمہ کے ذریعہ اللہ کی حمد اور اس کا شکر ادا کرتے تھے، الحمدُ لله الذي أذْهَبَ عَني الأذَى وعَافَاني سبحان اللہ! کیسی برمحل اور کتنی عارفانہ دعا ہے۔(معارف الحدیث:۵/۱۳۳)۔

۲- مفتی تقی عثمانی زید مجدہ کے افادات میں ہے:

اگر اِس دعا میں غور کریں تو یہ نظر آئے گا کہ اِس مختصر سی دعا میں نبی کریم ﷺ نے معانی کی عظیم کائنات بیان فرما دی ہے، اِس کے علاوہ ایک دوسری دعا بھی منقول ہے جس میں اِس سے زیادہ وضاحت ہے، آپ پڑھتے تھے:

الحمد لله الذي أذَاقني لذَتَه وأبقى فِيَّ قُوَّتَه و أذهب عن أذاه. (کنز العمال، رقم:۱۷۸۷۷)۔

یعنی اس اللہ کا شکر ہے جس نے مجھے اس کھانے کی لذت عطا فرمائی اور اِس کھانے میں جو قوت والے اجزاء تھے اور جو میرے جسم کو طاقت بخش سکتے تھے وہ اجزاء میرے جسم میں باقی رکھے اور جو اجزاء تکلیف دہ اور گندے تھے وہ میرے جسم سے دور کر دیے، آپ غور کریں کہ انسان دن رات یہ کام کرتا رہتا ہے لیکن اس کے نعمت ہونے کی طرف دھیان نہیں جاتا، ہم جب کھانا کھاتے ہیں تو ہمارے پیشِ نظر صرف زبان کا ذائقہ

اور لذت ہوتی ہے، کھاتے وقت اِس طرف دھیان نہیں ہوتا کہ یہ کھانا ہمارے اندر جا کر کیا فساد مچائے گا، کھائی جانے والی مختلف اشیاء کے مختلف اثرات ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تمھارے جسم میں ایک مشین بنائی ہے جو اس غذا کے ہر حصہ کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کرتی ہے، یہ خودکار مشین قوت والے اجزاء کو محفوظ رکھتی ہے اور بے فائدہ اجزاء کو پیشاب و پاخانہ کے ذریعہ خارج کر دیتی ہے؛ اِس لیے جب تم قضاء حاجت سے فارغ ہو تو اِس پر شکر ادا کرلو کہ آپ نے مجھ سے یہ گندگی دور فرما دی اور مجھے عافیت عطا فرمادی۔(اختصار: اسلام اور ہماری زندگی: ۹۹/۱۰)۔

۳- انسان کے پیٹ میں جو گندا فضلہ ہوتا ہے وہ ہر انسان کے لیے ایک قسم کے انقباض اور گرانی کا باعث ہوتا ہے، اگر وہ بروقت خارج نہ ہو تو اس سے طرح طرح کی تکلیفیں اور بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اگر طبعی تقاضے کے مطابق پوری طرح خارج ہو جائے تو آدمی ایک ہلکا پن اور ایک خاص قسم کا انشراح محسوس کرتا ہے اور اس کا تجربہ ہر انسان کو ہوتا ہے؛ اِس لیے قضائے حاجت سے فارغ ہونے کے بعد اللہ کی تعریف کرنے کا حکم ہے۔(سنن ابن ماجہ اردو: ۱۳۴/۱)۔

۴- ذرا سوچیے اگر پیشاب اور پاخانہ کے ساتھ انتڑیاں اور دیگر مخفی قوتیں اور طاقتیں بھی خارج ہو جائیں تو اللہ کے بغیر اِس درد و کرب سے کون محفوظ رکھ سکتا ہے؟ اب جب کہ قضائے حاجت کے وقت اللہ نے ان چیزوں سے ہماری حفاظت فرمائی؛ پس اُس ذات کا شکریہ ادا کرنا ضروری ہے، مذکورہ دعا کے ذریعہ اُسی حقِ شکر کی ادائیگی کا حکم ہے۔

۵- شریعت نے ''حمد وشکر'' کا ایک جامع نظام بنایا ہے، بندوں پر اللہ کی نعمتیں ہر آن برستی رہتی ہیں، سانس لینا اور چھوڑنا مستقل نعمتوں کا حصہ ہیں، ان نعمتوں کے بدلے میں اللہ کی تعریف اور اس کا شکریہ ادا کرنا بندگی اور عبدیت کا تقاضا ہے، گندگی کا دور ہونا اور عافیت نصیب ہونا بھی ایک نعمت ہے، پس اِس موقع پر اللہ کی تعریف کرنا ضروری ہے، اِس موقع پر مذکورہ جملہ کے ذریعہ اللہ کی تعریف کرنا اُسی نظامِ حمد وشکر کا ایک حصہ ہے، گویا ''غفرانک'' کے ذریعہ پہلے ادائے شکر میں کوتاہی پر معافی مانگی گئی اور دوسری دعا میں اُسی شکر کو ادا کرنے کی کوشش کی گئی، اور دونوں جملوں کا مشترکہ پیغام یہ ہے کہ انسان پوری زندگی اللہ کی تعریف اور گناہوں اور کوتاہیوں پر شرمندگی کے اظہار میں گذارے۔

یہ دعائیں دھیان سے پڑھنی چاھئیں:

اگر ہر مسلمان روزانہ بیت الخلاء جاتے وقت اور نکلتے وقت دھیان کے ساتھ دعائیں پڑھنے کا معمول بنالے تو کیا اس کے نتیجے میں اللہ جَلَّ شانہ کی عظمت اور محبت پیدا نہیں ہوگی؟ کیا اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کی خشیت پیدا نہیں ہوگی کہ جو مالک بے نیاز میرے جسم میں اتنی قیمتی مشینیں لگا کر میرے لیے یہ کام کرا رہا ہے، کیا میں اس کے حکم کی نافرمانی کروں؟ کیا میں اس کی مرضی کے خلاف زندگی گزاروں، اگر انسان یہ تصور کرنے لگے تو پھر کبھی گناہ کے پاس بھی نہ پھٹکے؛ اِس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ بیت الخلاء سے نکلتے وقت یہ دعا پڑھ لو، یہ کوئی منتر نہیں ہے؛ بلکہ اِس کے پیچھے ایک پورا فلسفہ ہے اور معانی کی پوری کائنات ہے جو اللہ تعالیٰ نے نبی کریم ﷺ کے ذریعہ ہم کو عطا فرمائی ہے؛ لہٰذا ان دعاؤں کو پڑھنے کی عادت ڈالیے اور اِس تصور کے ساتھ پڑھیے کہ اللہ تعالیٰ نے کیا نعمت ہم کو عطا فرمائی ہے، اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ کو بھی اِس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔(اسلام اور ہماری زندگی: ۹۹/۱۰)۔

☆☆☆

□ فکر اسلامی

(قسط-۱۱)

مفکر اسلام- ایک مطالعہ

ڈاکٹر محمد طارق ایوبی ندوی

حقیقت کا ادراک:

آج یہ عام مزاج بن چکا ہے کہ ہم اکثر جزوی کامیابیوں کی تشہیر کرتے ہیں اور اس پر خوشیاں مناتے ہیں اور بڑے خطرات اور چیلنجز سے آنکھیں بند کیے رہتے ہیں، اس سلسلہ میں ایسے حیرت انگیز مشاہدات سامنے آتے ہیں اور ایسی تصویر دیکھنے کو ملتی ہیں کہ بس! شاہ بانو کیس پر جب بل پاس ہوگیا اور مسلمانوں کو کامیابی ملی جس کا آج بھی لوگ جانے کن کن الفاظ میں تذکرہ کرتے ہیں، اس وقت بھی حضرت مولانا جن کو بے حد سرور ہونا چاہیے تھا، وہ قائد تھے، صدر تھے، لیکن نہیں وہ مفکر تھے، مدبر تھے اور حقیقت پسند تھے، لہذا انہوں نے اس خوشی کو جس طرح تعبیر کیا وہ ہمیں سوچنے پر مجبور کرتی ہے، مستقبل کا لائحہ عمل دیتی ہے اور ہمارے یہاں رائج انداز فکر پر لگام لگانے کے ساتھ ٹھوس اقدامات کے لئے مہمیز بھی کرتی ہے:

''نفقۂ مطلقہ کے سلسلہ میں سپریم کورٹ کے فیصلہ کے خلاف عوامی جمہوری جنگ کامیاب ہوئی اور پارلیمنٹ نے وہ بل بھاری اکثریت سے پاس کر دیا جو اس فیصلہ کے اثر کو ختم کرتا ہے، اور اس طرح آل انڈیا مسلم پرسنل لا کی جدو جہد ایک منزل پر کامیاب ہوئی۔ لیکن یہ جزوی و محدود کامیابی تھی، مسلمانوں کے سروں پر یونیفارم سول کوڈ کی تلوار اب بھی لٹک رہی ہے، اور اس کے نفاذ کے بعد یہ بل بھی غیر مفید و غیر مؤثر ہو جائیگا، اور مسلم پرسنل لا میں مداخلت کے بیسیوں دروازے کھل جائیں گے'' (کاروان زندگی ج۳ص۱۵۱۔۱۵۲)۔

مسلسل جدو جہد:

آج جس طرح سے ہم نے حقائق سے صرف نظر کر کے اپنے آپ کو محدود کر لیا ہے اور جس طرح نت نئے مسائل منہ کھول رہے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ حضرت مولانا کی اس بات بلکہ ''ان کی زندگی خود اس کی مثال تھی'' کو لائحہ عمل بنایا جائے اور جب جس چیز کی ضرورت و تقاضہ ہو اس کو اپنے نظام عمل میں جگہ دی جائے، ''جمہوری ملک میں حقوق کی حفاظت کا طریقہ'' کے عنوان سے لکھتے ہوئے آخر میں مولانا تحریر فرماتے ہیں:

''حقیقت میں ایک جمہوری ملک میں جو اکثریت کے ذریعہ (جس کے جذبات خواہشات و مقاصد بدلتے رہتے ہیں) آئین سازی کا دائمی و کلی حق رکھتا ہے، کسی فرقہ و اقلیت کو (جو اپنا مستقل دین، عائلی قانون اور ملی تشخص رکھتی ہے، اور وہ اس کو اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے) کسی وقت بھی مطمئن ہو کر

بیٹھنے اور حالات وحقائق سے آنکھیں بند کر لینے کی گنجائش نہیں، اس کے متعلق فاتح مصر عمرو بن العاص کی وہ آگاہی اور انتباہ بالکل حسبِ حال ہے، جو انہوں نے مصر کے فاتح و نئے حاکم عرب مسلمانوں کو دیا تھا، انتم فی رباط دائم'' (تم مستقل محاذ جنگ پر ہو) تمہیں ہر وقت چوکنا اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے'' (کاروان زندگی ج۳ص۱۵۶۔۱۵۷)۔

جرأت و حقیقت پسندی:

ایک طرف تو حکومت وقت سے عائلی قوانین پر گفت و شنید جاری تھی اور معاملہ کے حل ہونے کی امید تھی، دوسری طرف بابری مسجد جیسا خطرناک اور حساس چیلنج سامنے تھا، اس کا تالا کھولنے کی اجازت دینے پر ایسے وقت میں جبکہ شریعت کے عائلی قانون پر حملہ ہو چکا تھا اور اس کے تدارک ودفاع کی کوششیں ہو رہی تھیں، مولانا کا جو ردعمل آیا وہ بصیرت افروز، اقدامی اور حقیقت پسندانہ تھا:

''اجودھیا کی بابری مسجد کے سلسلہ میں یک طرفہ فیصلہ سے ہندوستان کے تمام مسلمانوں کو غیر معمولی صدمہ ہوا ہے، ایسے حالات میں جبکہ مسلمانوں کے جذبات پرسنل لا کے مسئلہ پر مجروح ہیں، اوران کی تمام تر جدوجہد اپنے ملی تشخص کو برقرار رکھنے اور دینی شعائر کے ساتھ زندہ رہنے کے لئے ہو رہی ہے، بابری مسجد پر پڑے ہوئے تالے کو کھول کر اسے دوسرے فرقہ کو پوجا اور درشن کی کھلی اجازت دینا، اور اس مسجد پر کسی قسم کی پابندی عائد کرنے کا حکم دینا کسی طرح دانشمندانہ اقدام سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا، اس لئے کہ اس اقدام سے خطرہ ہے کہ مسلمانوں کے جذبات مشتعل ہو جائیں، اور وہ یہ سمجھنے پر مجبور ہو جائیں کہ اس ملک پر صرف ایک فرقہ کی حکومت ہے، اور طاقت کے بل بوتے پر یک طرفہ فیصلہ کرکے دوسروں کے حقوق کو نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔

بابری مسجد کے بارہ میں یہ تاریخی حقیقت ہے کہ وہ مسلمانوں کی ملکیت اوران کی مسجد ہے، جس میں وہ ساڑھے چار سو سال سے زائد سے نمازیں ادا کرتے رہے ہیں، مسلمانوں میں اس اقدام سے اشتعال کا ہونا فطری بات ہے، اور یہ ان کی دینی غیرت وحمیت کی دلیل ہے، البتہ مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ فرقہ پرست عناصر کے اشتعال انگیز نعروں سے متاثر نہ ہوں، اس سے حالات مزید بگڑ جائیں گے، انہیں چاہیے کہ اپنی صفوں کو متحد رکھیں اور جس طرح انہوں نے مسلم پرسنل لا کے سلسلہ میں اپنے بے مثال اتحاد کا مظاہرہ کیا ہے، اسی طرح انہیں ان جیسے نازک مسائل کے بارے میں اپنے اتحاد کے مظاہرہ کے ساتھ دانشمندانہ اور ٹھوس قدم اٹھانا چاہیے اور حکومت وانتظامیہ کو وہ یہ باور کرا دیں کہ اقلیتوں پر ظلم وزیادتی اور خاص طور سے ان کی عبادت گاہوں پر قبضہ برداشت نہیں کیا جائیگا۔

یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ اگر حکومت نے مسلمانوں کے جذبات کا احترام نہ کیا اور بابری مسجد کے سلسلہ میں کئے گئے حالیہ اقدامات واپس نہ لئے تو اس کے نتائج بڑے سنگین اور خطرناک ہو سکتے ہیں۔

اس مسئلہ پر آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ نے بھی اپنے حالیہ اجلاس دہلی میں ایک تجویز منظور کر کے اخبارات کو اشاعت کے لئے ارسال کی ہے'' (ج۳ص۱۵۸۔۱۵۹)۔

سیاسی ہلچل پر مومنانہ اور مفکرانہ تبصرہ:

۱۹۸۶ء میں مولانا کراچی پہنچے تو وہاں موجودہ حکومت کے خلاف عوام موشگافیاں کر رہے تھے اور بے نظیر کے پاکستان

آنے پر اس کا ایسا استقبال ہورہا تھا مولانا کے الفاظ میں ''جیسے آسمان سے کوئی نجات دہندہ فرشتہ نازل ہوا ہے'' اس صورت حال سے مولانا کی طبیعت پر اثر پڑا، اور پھر مولانا خاموش نہ رہ سکے اور ذاتی ملاقاتوں نہیں بلکہ مجمع میں احقاق حق کیا اور فرمایا:

''جس معاشرہ کا حال یہ ہو کہ کوئی سریلی صدا لگا دے، کوئی بازیگر آکر سبز باغ دکھائے، کوئی شخص بھی قیادت کا جھنڈا بلند کردے تو اس کا ایسا استقبال کیا جائے کہ جیسے دیر سے اس کا انتظار تھا، اور یہی ایک خلا تھا، جو پر نہیں ہوا تھا، وہ آواز لگائے تو یہ معلوم ہو کہ جیسے دل سینوں سے نکل پڑیں گے اور سارے حدود و قیود پیچھے رہ جائیں گے، سیدنا علی مرتضیٰؓ نے اہل کوفہ کو مخاطب کرکے کہا تھا، انتم اتباع کل ناعق تم ہر آواز لگانے والے اور زور سے بولنے والے کے پیچھے لگ جاتے ہو'' پھر میں نے بتایا کہ قرآن شریف میں عہد موسوی کا ایک بڑا عبرت انگیز قصہ آتا ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

"وجاوزنا ببني اسرائيل البحر فاتوا على قوم يعكفون على اصنام لهم قالوا يٰموسىٰ اجعل لنا الها كما لهم اٰلهة قال انكم قوم تجهلون۔ ان هؤلاء متبر ما هم فيه وبٰطل ما كانوا يعملون"

ترجمہ: اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پارا تار دیا، پھر وہ ایسے لوگوں پر گذرے جو اپنے بتوں کو لئے بیٹھے تھے (اس پر بنی اسرائیل) کہنے لگے! اے موسیٰ ہمارے لئے بھی ایک دیوتا ایسا ہی بنا دیجئے جیسے ان کے (یہ) دیوتا ہیں، (موسیٰ) نے کہا واقعی تم لوگوں میں بڑی جہالت ہے، یہ لوگ جس کام میں لگے ہیں یہ تباہ ہوکر رہے گا اور یہ جو کچھ کررہے ہیں، ہے بھی (بالکل) باطل۔'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۷۳)۔

۱۹۸۶ء میں پاکستان کے حالات بے نظیر کی آمد، سیاسی گلیاروں میں ہلچل، بیرونی دنیا کی سازش اور پاکستان میں اس کے والہانہ استقبال کو ذہن میں رکھتے ہوئے مولانا کی گفتگو کا یہ انداز اور یہ رخ بھی دیکھیے اور مومنانہ فراست وجرأت کو محسوس کیجئے:

'' یہاں آپ کتنی دشواریوں، نگرانیوں، بدگمانیوں، خوردہ گیریوں اور کسی دوسرے فرقہ یا اکثریت کے منافرت ومخالفت سے محفوظ ہیں، حدیث میں نسوانی فطرت کی یہ کمزوری بیان کی گئی ہے، اس سے آپ کو دور رہنا چاہیے، حدیث میں کہا گیا ہے کہ عورت کی فطری کمزوری یہ ہے کہ عمر بھر شوہر اس پر احسان کرے پھر کسی وقت اس کی کسی خواہش یا فرمائش کی تعمیل میں تھوڑی سی کمی رہ جائے تو کہے کہ ہم نے تو اس گھر میں آکر کبھی آرام کا منہ نہیں دیکھا، ہم نے اس گھر میں کبھی سکھ نہیں پایا، هل من مزيد کا نعرہ تو خیر ایک معنویت رکھتا ہے لیکن هل من جديد کا نعرہ خطرناک ہے، جو بہت سے مسلم معاشروں اور آزاد مسلم حکومتوں کا شعار بن گیا ہے، پھر میں نے بتایا کہ کتنے مسلم وعرب ممالک میں اسلام اور دیندار، اسلامی قوانین کے نفاذ کے مطالبہ اور اسلامی تحریکوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جارہا ہے، آپ کا طریقۂ فکر اور طرز عمل حقیقت پسندانہ، ایجابی وتعمیری ہونا چاہیے، اپنے ملک کے حالات کا دوسرے ملکوں کے حالات سے تقابل کرنا چاہیے، پھر جو کچھ حاصل ہو، اس پر ثبات و دوام اور اس کی دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مزید توفیق عطا فرمائے، جلد ہر چیز کا جواب مایوسی اور محاذ آرائی سے نہیں دینا چاہیے، ذمہ داران حکومت کے خلاف پہلے ہی لمحہ پر صف آرائی کے بجائے افہام وتفہیم سے کام لینا اور ان کو اس مسئلہ میں مطمئن کرنے کی کوشش کرنی چاہیے'' (کاروان زندگی ج ۳ ص ۱۷۶)۔

☆☆☆

(جاری……)

❑ اصلاح و تربیت

تزکیۂ نفس اور اس کے طریقے

حافظ کلیم اللہ عمری مدنی، استاذ ومفتی: جامعہ دارالسلام عمرآباد
hskpbt.2009@gmail.com

قال اللہ تعالی قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا"[سورۃ الشمس ۹۔۱۰] ترجمہ جس نے اس (نفس) کو پاک کیا وہ کامیاب ہوا اور جس نے اسے خاک میں ملایا وہ ناکام ہوا۔

مذکورہ آیت کریمہ میں اللہ تعالی نے سات چیزوں کی قسم کھانے کے بعد یہ ارشاد فرمایا ہے کہ جس نے اپنے آپ کو شرک سے، معصیت سے اور اخلاقی خرابیوں سے پاک کرلیا یقیناً وہ اخروی فلاح سے ہمکنار ہوگا، یعنی جب تک حضرت انسان اپنے آپ کو دل کی بری بیماریوں سے پاک وصاف نہیں کرے گا اس وقت تک وہ کامیابی کی منزلوں تک پہنچ نہیں سکتا، اسی لیے جب ہم قرآن کریم کا مطالعہ کرتے ہیں تو یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ وہ قوم تباہ وبرباد ہوجاتی ہے جو مقصد حیات کو نہیں پہچانتی اور خدا فراموشی کی وجہ سے خود فراموشی میں مبتلا ہوتی ہے۔ ایمان اور عمل صالح دونوں ایسے اہم ہتھیار ہیں جن کے ذریعہ قوم ترقی کرتی ہے اور ان کے ترک کرنے پر ذلیل وخوار ہوتی ہے۔ لہذا ذیل میں چند اسباب کا تذکرہ ہے جن کے ذریعہ کا تزکیۂ نفس ممکن ہے۔ ان شاءاللہ تعالی۔

۱۔اتباع رسول ﷺ : اللہ تعالی سے محبت کا دعوی کرنے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی پیروی کرنا، آپ کو اسوہ، مقتدی بنانا، قائد اور امام اعظم تسلیم کرنا، آپ ﷺ کے ہر فیصلہ کو آخری جاننا، آپ کی لائی ہوئی شریعت کو آخری شریعت تسلیم کرتے ہوئے آپ ﷺ سے عقیدت ومحبت رکھنا ہماری نجات کا ضامن ہے۔ اور اللہ سے محبت کا تقاضہ بھی یہی ہے کہ آپ کو حقیقی رہبر اور رہنما تسلیم کیا جائے جیسا کہ اللہ نے ارشاد فرمایا "**قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ**" اگر تم اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری اتباع کرو اللہ تم سے محبت کرے گا۔ (آل عمران ۔۳۱) اتباع رسول ﷺ میں ہی تمام مسلمانوں کے دینی واخروی مسائل کا حل مضمر ہے۔

۲۔نماز کی پابندی : نماز ذکر الہی ہے۔ جسے خشوع وخضوع کے ساتھ وقت کی پابندی کرتے ہوئے، جماعت کے ساتھ ادا کیا جائے تو یقیناً دلوں کی دنیا میں انقلاب برپا ہوگا، دین ودنیا کی سعادت نصیب ہوگی، آخرت میں سرخ روئی کا ذریعہ بھی نماز ہے، نیز نماز ہر قسم کی بے حیائی سے روکنے والی ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "**وأقم الصلاۃ ان الصلاۃ تنھی عن الفحشاء والمنکر ولذکر اللہ اکبر واللہ یعلم ما تصنعون**" [العنکبوت: ۴۵] اور آپ نماز قائم کیجئے بے شک نماز فحش اور برے کاموں سے روکتی ہے ذکر الہی بہت بڑی چیز ہے اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ تعالی اسے بخوبی جانتا ہے۔ نیز ارشاد نبوی ہے "مسلمانوں اور غیر مسلموں میں فرق کرنے والی چیز نماز ہے (ترمذی)۔

۳۔ تلاوت قرآن کریم : قرآن مجید کے ہم پر پانچ حقوق ہیں: اس پر ایمان لانا، اس پر عمل کرنا، تدبر کرنا، تلاوت کرنا اور اس کی تعلیم کی تبلیغ کرنا، نبی کی دعوت اور طریقہ اصلاح میں تلاوت کتاب مؤثر طریقہ رہا، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "**ھو الذی بعث فی الامیین رسولا منھم یتلوعلیھم آیاتہ ....**" اللہ کی ذات وہی ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں سے ایک کو رسول بھیجا جو انہیں اس کی آیتیں پڑھ کر سناتا ہے۔ (سورۃ الجمعہ: ۲)۔ یعنی بعثت نبوی کے اہم فرائض میں سے ایک تلاوت کتاب بھی ہے جو باعث

ہدایت بھی ہے، رحمت الٰہی کو پانے کا ذریعہ اور ایمان میں زیادتی کا ایک اہم سبب بھی ہے، جیسا کہ ارشاد ربانی ہے "انما المؤمنون الذین اذاذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم آیاتہ زادتھم ایمانا وعلی ربھم یتوکلون "[الانفال ۲] بے شک مومن تو وہی ہیں کہ جب ان کے پاس اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے ہیں اور جب ان کے پاس اس کی آیتوں کی تلاوت کی جاتی ہے تو وہ ان کے ایمان کو زیادہ کرتی ہے اور وہ اپنے رب پر ہی بھروسہ کرتے ہیں۔

٤۔تقوی الٰھی : خوف خدا بھی اصلاح نفس کا ذریعہ ہے، جب تک تقوی ہماری زندگی میں داخل نہیں ہوگا اس وقت تک اصلاح نفس کی امید رکھنا بھی بے کار ہے، ارشاد ربانی ہے "وتزودوا فان خیر الزاد التقوی واتقون یا أولی الالباب "[البقرۃ] اور اپنے ساتھ زادسفر لیا کرو، بے شک بہترین توشہ اللہ تعالی کا ڈر ہے اور اے عقل مندو! تم مجھ سے ہی ڈرو۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا "اتق اللّٰہ حیث ما کنت وأتبع السیئۃ الحسنۃ تمحھا وخالق الناس بخلق حسن" [الترمذی] تم جہاں کہیں بھی رہو اللہ سے ڈرتے رہو اور گناہ کے سرزد ہونے کے فوراً بعد نیک کام کرو، وہ نیکی اس گناہ کو مٹادے گی اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ۔

۵۔توبہ واستغفار : اصلاح نفس سے قبل نفس کا محاسبہ کرتے ہوئے اپنے کیے ہوئے گناہوں پر نادم ہونا، اس گناہ کو ترک کرنا، اللہ سے معاہدہ کرنا کہ یا رب ایسی غلطیاں اور کوتاہیاں آئندہ سے نہیں ہونگی، نیز لوگوں کے حقوق کما حقہ ادا کرنا۔ اللہ سے خالص توبہ کرنا اصلاح نفس کے لیے نہایت ہی معاون ومدد ثابت ہوگا، ارشاد ربانی ہے "یا أیھا الذین آمنوا توبوا الی اللہ توبۃ نصوحا عسی ربکم أن یکفر عنکم سیئاتکم ویدخلکم جنات تجری من تحتھا الانھار "[التحریم۸] ترجمہ : اے ایمان والو! اللہ سے خالص توبہ کرو، امید کہ تمہارا رب معاف فرمائے اور تمہیں ایسی جنتوں میں داخل کردے جن کے نیچے سے نہریں بہتی ہوں گی۔ ایک اور موقع پر ارشاد ربانی ہے "توبوا الی اللہ جمیعا أیھا المومنون لعلکم تفلحون"[النور: ۳۱] ترجمہ : اے مومنو! تم سب کے سب اللہ سے توبہ کرو شاید کہ تم کامیاب ہوجاؤ، اور نبی کریم ﷺ کا ارشاد ہے: اے لوگو تم اللہ سے توبہ کرو اس لئے کہ میں بھی دن میں سو مرتبہ اللہ عزوجل سے توبہ کرتا ہوں۔

٦۔ دعا: سچے دل کے ساتھ دربار الٰہی میں ہاتھ پھیلانا بھی اصلاح نفس کے لیے ایک اہم وسیلہ ہے اور ہر مشکل مسلہ کا حل دعا ہے، **اللہ سے مانگنا، مشکلات میں اُس سے رجوع کرنا ایک عبادت ہے، بلکہ عبادتوں کا مغز دعا ہے جب بندہ اللہ سے مانگتا ہے تو اللہ تعالی خوش ہوجاتا ہے اور نہیں مانگنے سے اللہ تعالی ناراض ہوجاتا ہے۔ دعاء کے لیے ضروری یہ ہے کہ صدق دل سے مانگی جائے، یقین کے ساتھ ہاتھ اٹھایا جائے، اس لئے کہ بے یقینی کی کیفیت میں کی جانے والی دعائیں قبول نہیں کی جاتیں**، اللہ رب العزت کا ارشاد ہے "و اذ اسالک عبادی عنی فانی قریب أجیب دعوۃ الداع اذادعانی فلیستجیبوا لی ولیؤمنوا بی لعلھم یرشدون "[البقرۃ۱۸٦] ترجمہ: اور اے نبی جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے پوچھیں تو کہہ دو بے شک میں قریب ہوں، پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں جب وہ مجھے پکارتا ہے، اسی لیے انھیں چاہیے کہ وہ میری بات مان لیں اور مجھ پر ہی ایمان ویقین رکھیں شاید کہ وہ راہ راست پر آجائیں۔

۷۔انابت الی اللّٰہ : انابت الی اللہ کا مطلب ہر معاملہ میں اللہ کی طرف رجوع کرنا، اللہ ہی کو مشکل کشا، عبادت کے لائق اور خوف ورجا کا محور جاننا، اسی کو راضی کرنا اور اسی سے خیر طلب کرنا ہے۔ اللہ تعالی نے فرمایا "وأنیبوا الی ربکم وأسلموا لہ من قبل أن یاتیکم العذاب ثم لا تنصرون " اور تم اپنے رب کی طرف جھک پڑو اور اس کے لیے سر تسلیم خم کرو قبل اس کے کہ تم پر عذاب آجائے پھر تم مدد نہ کیے جاؤ گے۔

اللہ سے دعا گو ہوں کہ رب العالمین ہمیں اپنی اور امت کی اصلاح کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

☆☆☆

□ تاریخ کے جھروکوں سے

علم ریاضی اور ہندوستانی علماء

طلحہ نعمت ندوی
استاد: جامعہ سید احمد شہید ملیح آباد، لکھنؤ

علوم عقلیہ کی تمام شاخوں میں انفرادی واجتماعی زندگی میں علم حساب وریاضی کی ضرورت واہمیت مسلم ہے، دنیا کے معاملات ومسائل تو الگ رہے، مذہبی مسائل واحکام میں بے شمار ایسے مواقع آتے ہیں جہاں اس فن کی بہت سخت ضرورت محسوس ہوتی ہے اور بغیر مہارت فن ان مسائل کی پیچیدگیوں کا سلجھانا مشکل معلوم ہوتا ہے، اس لیے امام غزالیؒ نے اسے ان علوم میں شمار کیا ہے، جن کی تحصیل فرض کفایہ ہے، لکھتے ہیں:

"أما فرض الكفاية فهو كل علم لا يستغنىٰ منه في قوام أمور الدنيا كالطب إذ هو ضروري في حاجة بقاء الإنسان وكالحساب فإنه ضروری في المعاملات، وقسمة الوصايا والمواريث وغيرهما"(۱) (جہاں تک فرض کفایہ کا تعلق ہے تو یہ ہر وہ علم ہے جس کے بغیر دنیا کے امور ومسائل میں استفادہ ممکن نہیں، جیسے کہ علم طب کہ وہ انسان کی صحت کے لیے ضروری ہے، اور علم حساب جو معاملات، تقسیم میراث اور وصایا کے لیے لازمی ہے)۔

لیکن آج ہمارے ہندوستانی مدارس اسلامیہ کا بڑا طبقہ اس فن سے یکسر بے گانہ ہے، اس مضمون میں ہمیں یہ دکھانا ہے کہ کیا عہد گزشتہ میں بھی مدارس میں اس فن سے یہی بیگانگی تھی یا اس فن کے باکمال اور ارباب تصانیف بیشتر مدرسہ ہی کے پروردہ تھے۔

یہی حال دوسرے علوم وفنون کا ہے جن پر آج کالجوں اور یونی ورسٹیوں کی اجارہ داری سمجھی جاتی ہے، کیا وہ سب ہمیشہ مدرسہ میں اسی طرح اجنبی رہے ہیں یا آج ان کا یہ حال ہوگیا ہے۔ضرورت ہے کہ اس بیگانگی کا جائزہ لیا جائے اور ہر فن کی قدیم وجدید کڑیوں کو ملا کر اس اجنبیت کو دور کرنے کی کوشش کی جائے۔

علم حساب کیا ہے؟ صاحب کشف الظنون کے الفاظ میں ہم پہلے اس کا تعارف پیش کرتے ہیں، وہ لکھتے ہیں:

"هو علم يعرف بها طرق استخراج المجهولات العددية من المعلومات العددية المخصوصة، والمراد بالاستخراج معرفة كمياتها وموضوعه العدد، إذ يبحث فيه عن عوارضه الذاتية، والعدد هو المتألفة من الوحدات، فالوحدة مقومة للعدد، وأما الواحد فليس بعدد ولا مقوم له، وقد يقال لكل ما يقع على العدد فيقع على الواحد، ومنفعته فى ضبط المعاملات وحفظ الأموال وقضاء الديون، ويحتاج إليه في العلوم الفلكية وفي المساحة والطب وقيل يحتاج إليه في جميع العلوم." (یہ ان قواعد کے جاننے کا نام ہے جن کے ذریعہ معلوم اعداد کی مدد سے نامعلوم اعداد نکالے جاتے ہیں، نکالنے سے مراد ان کی تعداد کا معلوم کرنا ہے، اس فن کا موضوع عدد ہے، کیوں کہ اس میں عدد کے ذاتی حالات وعوارض سے بحث کی جاتی ہے، اور عدد نام ہے مختلف اکائیوں کے مجموعہ کا، اکائی عدد کے وجود میں آنے کا ذریعہ ہے، ایک کو اس لئے عدد نہیں کہا جاتا، کیوں کہ وہ کسی سے نہیں بنتا، کبھی کبھی اس لفظ کا اطلاق ہر اس چیز پر بھی ہوتا

ہے جو شمار میں آئے، اس لئے ایک بھی اس میں شامل ہو جاتا ہے، اس علم کا فائدہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ معاملات گرفت میں آجاتے ہیں، مال کی حفاظت اور قرضوں کی ادائیگی میں اس کی ضرورت پڑتی ہے، علم فلکیات، مساحت اور طب میں بھی اس کی ضرورت پڑتی ہے اور ایک قول کے مطابق تمام علوم میں اس کی ضرورت پیش آتی ہے)۔

علمائے اسلام کسی دور میں بھی اس کی اہمیت وضرورت سے غافل نہیں رہے، رجال وسیرت کی کتابوں میں سیکڑوں ایسے علماء کرام کے نام مل جائیں گے جو فقہ وحدیث اور تفسیر کے ساتھ اس فن میں بھی کامل دستگاہ رکھتے تھے، خود عہد نبویؐ میں اس فن کی تعلیم کا اشارہ ملتا ہے۔ ہمیں یہاں دیگر ممالک کے علماء سے صرف نظر کر کے صرف ہندوستان کے علماء مصنفین اور اس کی تدریس کا تذکرہ مقصود ہے۔

حضرت ملا نظام الدین کے نصاب درس میں علم ریاضی کی حسب ذیل کتابیں داخل تھیں:

''خلاصۃ الحساب، تحریر اقلیدس، مقالۂ اولیٰ، تشریح الافلاک، رسالہ خوشجیہ، شرح چغمینی۔''

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی خود نوشت سوانح میں جہاں دیگر کتب نصاب کا ذکر کیا ہے وہیں یہ بھی تحریر فرمایا ہے کہ ہیئت وحساب میں بھی بعض مختصر رسائل پڑھے، حضرت شاہ صاحب کی تصانیف کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کا مطالعہ برائے مطالعہ نہیں تھا، وہ اپنی کتابوں میں جگہ جگہ ریاضی کے پیچیدہ مسائل کو بڑی آسانی سے حل کر دیتے ہیں۔ جس سے اس فن میں بھی آپ کی مہارت ودسترس کا اندازہ ہوتا ہے۔

حضرت شاہ اسماعیل شہید کے تذکرہ میں ان کے سوانح نگار لکھتے ہیں: ''آپ (شاہ اسماعیل) کے خاندان میں بچوں کو ریاضی بھی پڑھائی جاتی تھی، تاکہ طبیعت میں سلامت روی اور اعتدال آجائے، لہٰذا اسی عمر میں آپ نے ریاضی اور جیومٹری پر کافی عبور حاصل کر لیا تھا، ہر دو علوم کے مشکل مسائل نہایت آسانی سے حل کر کے اپنے ساتھیوں کو حیرت زدہ کر دیتے تھے۔'' (۳)

مولانا مناظر احسن گیلانیؒ کی ہندوستان کی علمی تاریخ پر جیسی وسیع نظر تھی وہ اہل علم سے مخفی نہیں، مولانا کو بھی اس کا احساس تھا کہ نصاب تعلیم کے تذکرہ میں حساب کا ذکر بہت ہی کم آتا ہے، اس کا اظہار وہ حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں:

''ہندوستان کے تعلیمی نظام میں جس چیز کی ہمیں کمی نظر آتی ہے یا کم از کم اس کا تذکرہ نہیں کیا جاتا عجیب بات ہے کہ وہ ریاضی (حساب) کا مسئلہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اسلامی عہد میں ہندوؤں کے سوا خود مسلمانوں میں بھی بعض بڑے بڑے محاسب گزرے ہیں۔'' (۴)۔

مولانا گیلانیؒ کی اس بات کی تائید کے لیے نزہۃ الخواطر کے صفحات الٹنے چاہئیں، جہاں اس فن کے ماہرین سیکڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے، جابجا مصنف نزہۃ الخواطر ریاضی کے ماہر علماء کا اور دیگر فنون کا ذکر کرتے نظر آتے ہیں، ان میں سے ذیل کے نام اس فن میں ہندوستان کی آبرو ہیں:

''(۱) شیخ عبداللہ ٹھٹھوی (۲) ابوالفیض فیضی (۳) فرید الدین دہلوی (۴) عصمت اللہ سہارن پوری (۵) تفضّل حسین لکھنوی (۶) نجم الدین کاکوروی (۷) رفیع الدین مرادآبادی (۸) احمد بن محمد مدراسی (۹) نیاز احمد بریلوی (۱۰) رستم علی سنبھلی (۱۱) غلام حسین جون پوری (۱۲) عنایت احمد کاکوروی (۱۳) نواب فخر الدین حیدرآبادی (۱۴) غلام احمد خاں حیدرآبادی (۱۵) گلشن علی جون پوری (۱۶) ذکاء اللہ دہلوی۔''

ہندوستان میں اسلامی علوم وفنون کے مورخ مولانا سید عبدالحی حسنی اس ملک میں اس فن کی پذیرائی اور ترقی کا تذکرہ ان الفاظ میں کرتے ہیں۔

''اس فن میں ہندوستانی علماء نے بہت سی نئی دریافتوں کا

اضافہ کیا ہے، مثلاً غلام حسین نے ارقام ستینی کے حساب میں تجنیس اور رفع کے لیے کچھ نقشے بنائے ہیں جن سے لکھنے کی زحمت دور ہو جاتی ہے...... قاضی نجم الدین کاکوروی نے مکعب بنانے کا طریقہ دریافت کیا ہے۔''(۵)

اس کے بعد مولانا عبدالحی صاحب نے ہندوستان میں اس فن میں لکھی گئی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن میں علم حساب میں ۷/ کتابوں کا اور فن جبر ومقابلہ میں گیارہ کتابوں کا ذکر ہے، ان کے علاوہ علم المساحت، علم الھیئت، علم المناظرۃ، علم الھندسہ (جیومٹری) اور فن جر ثقیل میں متعدد کتابوں کا ذکر ہے۔

حساب کی چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

''(۱) ضابط القواعد از شیخ عصمت اللہ سہارن پوری (۲) ترجمہ لیلاوتی از فیضی ناگوری (۳) علم الحساب پر ایک رسالہ از محمد ہاشم انبالوی (۴) نقود الحساب (۵) اعظم الحساب (۶) زبدۃ الحساب (۷) حساباً یسیراً (۸) رسالہ در علم حساب (۹) خلاصۃ الحساب کی کئی شرحیں (۱۰) ملخصات الحساب از مفتی عنایت احمد کاکوروی (۱۱) کنز الحساب از مفتی رفیع الدین مرادآبادی۔(۶)''۔

جس فن میں ہندوستانی علماء نے مجتہدانہ کارنامہ انجام دیا ہو سمجھ میں نہیں آتا کہ آج وہ فن مدارس کے حلقہ میں اتنا بیگانہ کیوں ہے کہ اس سے بے اعتنائی ولاعلمی ہی علماء کا امتیاز ہے، اگر مدارس میں شامل بھی ہے تو اسے سکھانے والے عصری تعلیم یافتہ ہیں۔

انگریزوں کے نصاب تعلیم کے نفاذ کے بعد یقیناً اس فن نے دوسرا رخ اختیار کیا، اور قدیم منہج کے بجائے انگریزوں کے منہج کے مطابق اس کی تعلیم ہونے لگی، لیکن اس کے باوجود بھی یہ فن علماء کے حلقوں میں بے گانہ نہ تھا، دلی کالج میں قدیم وجدید دونوں نظام ہائے تعلیم رائج تھے، ریاضی کی کتابیں انگریزوں کی وضع کردہ تھیں، لیکن اس میں بھی ہمیں اس فن میں کئی نام ور علماء کے نام ملتے ہیں، جنھوں نے اس فن میں یہیں دستگاہ حاصل کی، مولانا ذوالفقار علی دیوبندی نے انگریزی سے بعض حساب کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا، دلی کالج کے استاذ الکل مولانا مملوک علی نانوتوی نے اقلیدس کے ایک رسالہ کا ترجمہ کیا اور یہیں شیخ الکل حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے تعلیم پائی اور ریاضی کے فن میں امتیازی حیثیت حاصل کی۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی کے رفیق وہم دم دیرینہ مولانا یعقوب بن مولانا مملوک علی نانوتوی تحریر فرماتے ہیں: ''والد مرحوم نے مولوی صاحب کو مدرسہ عربی سرکاری میں داخل کیا اور مدرس ریاضی کو فرمایا کہ ان کے حال سے متعرض نہ ہوں جو میں ان کو پڑھالوں گا، اور فرمایا کہ تم اقلیدس خود دیکھ لو اور قواعد حساب کی مشق کرلو، چند روز میں چرچا ہوا مولوی صاحب سب معمولی مقالے دیکھ چکے اور حساب پورا کرلیا، از بسکہ یہ واقعہ نہایت تعجب انگیز تھا، طلبہ نے پوچھ پاچھ شروع کی، یہ کب عاری تھے، ہر بات کا جواب باصواب تھا، آخر منشی ذکاء اللہ چند سوال کسی ماسٹر کے بھیجے ہوئے لائے اور وہ نہایت مشکل سوال تھے، ان کے حل کرلینے پر مولانا کی نہایت شہرت ہوئی اور حساب میں کچھ ایسا ہی حال تھا۔(۷)

اس واقعہ سے حضرت مولانا قاسم کی ریاضی دانی کا کچھ اندازہ ہوسکتا ہے، لیکن افسوس کہ آج کے مدارس کے ثانوی درجات میں یہ فن داخل نصاب ضرور ہے لیکن شاید ہی کوئی ایسا نمونہ پیش کیا جاسکتا ہے جس نے خالص مدرسہ کی تعلیم سے اس فن میں کمال پیدا کیا ہو اور اس کا درس دیتا ہو، آج مدارس میں اس فن کی تدریس تمام تر عصری تعلیم یافتہ حضرات کی رہین منت ہے، ضرورت ہے کہ اس اہم فن پر مدارس میں توجہ صرف کی جائے جس کی واقفیت پر بہت سے علوم اسلامی کے مسائل کا حل موقوف ہے، نیز دیگر فنون عقلی جو کبھی مدارس کا لازمی حصہ تھے اور زندگی کی ضرورت ہی نہیں بلکہ شریعت اسلامی کی ضرورت ہیں، مثلاً ہندسہ وہیئت ومساحت، فلکیات، ان سب پر علماء اپنی توجہ صرف کریں اور اپنے قدیم علماء اور اسلاف کی روایتوں اور یادگاروں کو زندہ کریں۔

(...... **بقیہ صفحہ نمبر ٦٤ پر**)

❑ تنقیدی مطالعہ

تفسیر ثنائی: ایک علمی مطالعہ

نذیر احمد علائی
ریسرچ اسکالر شعبہ دینیات، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

مولانا ابوالوفاء ثناء اللہ امرتسریؒ (سرگودھا) (پیدائش ۱۸۶۸ء۔ وفات ۱۹۴۸ء):

مولانا امرتسری برصغیر ہندو پاک کی نامور شخصیت تھے، ان کا شمار بیسویں صدی عیسوی کے اکابر علماء کرام میں ہوتا ہے، مولانا کے آباء واجداد کشمیر کے رہنے والے تھے اور کشمیریوں کے منٹو خاندان سے تعلق رکھتے تھے، جو وہاں کے برہمنوں کی مشہور شاخ ہے، اس خاندان کے بہت سے افراد علماء وصوفیاء کے اثر تبلیغ سے حلقہ بگوش اسلام ہوگئے تھے، مولانا کے والد کا نام خضر جوؔ اور تایا کا نام اکرم جوؔ تھا، یہ علاقہ ڈور کے باشندے تھے جو تحصیل اسلام آباد (اننت ناگ) میں واقع ہے، کشمیر کے زیادہ تر لوگ اس زمانے میں پشمینے کا کام کرتے تھے، مولانا کے والد اور تایا کا بھی یہی کاروبار تھا، یہ لوگ کاروبار کے سلسلے میں امرتسر آگیے اور یہیں مستقل سکونت اختیار کرلی تھی، آپ امرتسر میں جون ۱۸۶۸ء میں پیدا ہوئے۔ پھر جب ۱۹۴۷ء میں ملک تقسیم ہوگیا تو مرحوم پہلے گوجرنوالہ تشریف لایے پھر سرگودھا میں مستقل سکونت اختیار فرمائی، اس طرح اسی (۸۰) سال عمر پاکر موصوف کو ۱۵ مارچ ۱۹۴۸ء میں قیامت تک کے لیے سرگودھا کی سرزمین نے اپنے پہلو میں چھپالیا اور یہ علم وفضل کا بادشاہ اور مسلک اہلحدیث کا یکتا خادم آخری نیند سوگیا۔(۱)

چودہ سال کی عمر میں حصول علم کا شوق دامن گیر ہوا، اُس زمانے میں امرتسر میں مولانا احمد اللہ کا سلسلہ درس جاری تھا، مولانا ان کے حلقہ درس میں شامل ہوگیے۔(۲) حدیثِ رسولؐ پڑھنے کے لیے حافظِ حدیث مولانا عبدالمنان وزیرآبادیؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور وہاں سے ۱۸۹۹ء میں سندِ فراغت حاصل کی۔(۳) اس کے بعد دہلی پہنچے اور شمس العلماء حضرت میاں نذیر حسین محدث دہلویؒ کی شاگردی اختیار کرلی، اور حافظ عبدالمنان وزیرآبادی کی سند دکھا کر ان سے حدیث میں سند واجازت حاصل کرنے کا شرف حاصل کیا۔(۴) شیخ الکل سے حدیث میں سند واجازت سے فیض یاب ہونے کے بعد مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور کا رخ کیا، لیکن وہاں کا قیام بہت مختصر رہا، ان دنوں دار العلوم دیوبند میں حضرت مولانا محمود حسنؒ مسند تدریس پر فائز تھے، اور مولانا باقاعدہ ان کے حلقہ تلمیذ میں داخل ہوگیے، اور ان سے معقولات ومنقولات اور ہر قسم کی کتبِ درسیہ کی تکمیل کی، اور اس طرح مولانا وزیرآبادی اور دیوبند کے درس حدیث میں جو فرق وامتیاز تھا، اس سے بھی استفادہ کیا، دیوبند کی سند کو مولانا اپنے لیے باعثِ فخر قرار دیتے تھے، دیوبند سے فراغت کے بعد انھوں نے کانپور کا عزم کیا، ان دنوں مسندِ تدریس پر مولانا احمد حسنؒ متمکن تھے، معقول ومنقول میں ان کی مہارت کی وجہ سے حلقہ طلبہ میں ان کے درس کی بڑی شہرت تھی، اس لیے

مولانا نے ان سے استفادہ ضروری سمجھا،۱۸۹۲ء میں مولانا نے مدرسہ فیض عام کانپور سے سند فراغت حاصل کی۔(۵)ان مختلف مدارس کے اسلوبِ تدریس میں نمایاں فرق تھا،مولانا نے اپنی خودنوشت سوانح میں بھی اس کا ذکر کیا ہے،مگر فرق کی نوعیت واضح نہیں فرمائی،مولانا لکھتے ہیں: ''پنجاب میں حافظ عبدالمنانؒ میرے شیخ الحدیث تھے،دیوبند میں مولانا محمود حسنؒ تھے اور کانپور میں مولانا احمد حسنؒ استاذ العلوم والفنون میرے شیخ الحدیث تھے،اس لیے میں نے حدیث کے تینوں استادوں سے جو طرز تعلیم سیکھا،وہ بالکل ایک دوسرے سے مختلف ہے، جس کے ذکر کا یہ موقعہ نہیں۔''(۶)اس طرح مولانا نے تین مختلف مکاتب فکر کے مدرسوں سے کسب فیض حاصل کیا تھا۔ سب سے پہلے اہل حدیث مکتب فکر سے،پھر دارالعلوم دیوبند سے اور آخر میں مدرسہ فیض عام کانپور سے،مولانا نے فیض عام کانپور میں اپنے پڑھنے کا ذکر اپنی تفسیر میں بھی کیا ہے۔(۷)

مولانا امرتسریؒ نے اپنی تعلیم کے ابتدائی دنوں ہی سے بحث ومناظرہ میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا،اور غیر مسلموں سے بحثیں بھی چھیڑتے تھے،بعض اوقات آپ امرتسر کے گرجا میں تشریف لے جاتے تھے،پادریوں کی تقریر سنتے اور پھر اس پر اعتراضات کرتے(۸)۔

مولانا کی تفسیر نویسی: مختلف میدانوں میں بیک وقت کام کرنے کے ساتھ ساتھ مولانا امرتسریؒ تفسیر نویسی جیسی عظیم وجلیل دینی وقرآنی خدمت سے غافل نہ رہے،انھوں نے قرآن کریم کی مختلف انداز سے باقاعدہ چار تفسیریں لکھی،دو عربی زبان میں،اور دو اُردو میں،دو پایہ تکمیل کو پہنچ کر بہت مقبول ہوئیں،اور دو ناقص ہی رہ گئیں،ان کی تکمیل کا انہیں موقع نہ ملا، نامکمل عربی تفسیر ''بیان الفرقان علی علم البیان'' جو سورہ بقرہ کی تفسیر پر مشتمل ہے،اس کی پہلی جلد۱۹۳۴ء میں ثنائی برقی پریس امرتسر سے شائع ہوئی،یہ تفسیر عربی ادب،صرف ونحو اور علم المعانی اور علم البیان کے اصول پر لکھی ہے۔دوسری نامکمل اُردو تفسیر ''تفسیر بالرائے''اس تفسیر کی صرف ایک جلد۱۹۳۹ء میں امرتسر سے شائع ہوئی،جس میں مولانا نے اپنے عہد کی مروجہ تفاسیر وتراجم قرآن کی اغلاط پیش کر کے ان کی اصلاح کی(۹)، آپ نے اپنی زندگی میں ان کے علاوہ ایک پانچویں تفسیر بھی لکھی ہے،جو''برھان التفاسیر'' کے نام سے موسوم ہے،یہ تفسیر اصلاً مجلّہ اہل حدیث امرتسر میں مضمون کی شکل میں قسط وار شائع ہوتی رہی تھی،اس کے علاوہ انھوں نے علوم القرآن پر بھی متعدد کتابیں تصنیف کیں۔(۱۰)۔

مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ کی جو دو تفسیریں پایہ تکمیل کو پہنچیں، اور جنھیں شہرت وبقائے دوام حاصل ہے،ان میں سے ایک عربی تفسیر ''تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن'' ہے، دوسری ''تفسیر ثنائی'' جو اردو میں ہے،عربی تفسیر ایک جلد میں ہے جو ۴۰۲ صفحات پر مشتمل ہے،اس عربی تفسیر کو مولانا نے ۱۳۲۱ھ میں مکمل کیا،اور ان کی حیات میں اس کے دو ایڈیشن شائع ہوئے،پہلا ایڈیشن ۱۹۰۳ء میں امرتسر سے (جو ۵۰۸ صفحات پر مشتمل ہے،دوسرا ۱۹۲۹ء رمضان میں آفتاب برقی پریس،شہر امرتسر سے جو ۴۰۲ صفحات پر مشتمل ہے) نکلے،عرصہ کے بعد اس کا اب تیسرا ایڈیشن لاہور سے شائع ہوا۔(۱۱)۔

تفسیر ثنائی کا تعارف: یہ تفسیر آٹھ جلدوں میں پھیلی ہوئی ہے جو مولانا کی زندگی میں ان کے زیر اہتمام امرتسر کے چشمہ نور پریس سے سات جلدوں میں شائع ہوئی،جس کی طبع اول ۱۸۹۵ء میں شروع ہوئی،اور یہ سلسلہ ۱۹۲۸ء تک جاری رہا،زیر بحث تفسیر کا وہ نسخہ،جس کو ارشد بن حاجی محمد سلمان نے دس جولائی ۱۹۷۹ء میں ثناء اللہ امرتسری اکیڈمی ۱۲۴۴۰۔جی۔پی روڈ،دہلی۔(۶) سے شائع کیا ہے،اس تفسیر

کو حال ہی میں دہلی کے ایک اور ادارہ نورالبیان ۱۲۱۴ء۔اجمیری گیٹ، دہلی نے بھی شائع کیا ہے(۱۲)۔ نیز اس تفسیر کی پہلی جلد ۱۸۹۵ء میں منظر عام پر آئی اور آخری جلد ۱۹۳۱ء میں شائع ہوئی، یوں اس کی تکمیل پر چھتیس برس کا عرصہ صرف ہوا(۱۳)۔اس تفسیر میں مولانا نے قرآن کی رو سے اسلام کی حقانیت ثابت کی ہے اور اس کے مقابلے میں غیر مذاہب کے موقف کو ہدف تنقید ٹھرایا ہے؛ لیکن اس ضمن میں مولانا کا انداز کلام نہایت عمدہ، انتہائی موثر اور مدلل ہے، حریف کے مقابلے میں تحمل و بردباری ان کا خاصا تھا جو اس تفسیر کی ہر بحث میں موجود ہے، یہ اپنی نوعیت کی واحد تفسیر ہے جس میں قرآن کی روشنی میں اپنے دور کے ان تمام نقطہ ہائے فکر کی تغلیط کی گئی ہے جو اسلام، پیغمبر اسلام اور احکام اسلام کو نشانہ طعن وتشنیع ٹھہراتے تھے(۱۴)۔مولانا کے تفسیری حواشی مناظرانہ طرز کے ہیں جن میں فرق باطلہ کی تردید میں مدلل جوابات دیے گیے ہیں سرسید کے عقائد کی بھی پرزور تردید کی ہے(۱۵)۔مزید برآں اس تفسیر کی پہلی جلد سرسید احمد خانؒ کی زندگی میں شائع ہوئی تھی، مولانا ثناءاللہ نے لکھا ہے ''تفسیر ہذا کا طبع اول سرسید مرحوم کی زندگی میں ہوا تھا یہ جلد ان کو پہنچ چکی تھی، ہم بہ گمان حسن خاتمہ دعا کرتے ہیں'' وَالَّذِيْنَ جَاؤُوا مِن بَعْدِهِمْ يَقُولُونَ رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَلِإِخْوَانِنَا الَّذِيْنَ سَبَقُونَا بِالْإِيْمَانِ وَلَا تَجْعَلْ فِيْ قُلُوبِنَا غِلًّا لِّلَّذِيْنَ آمَنُوا رَبَّنَا إِنَّكَ رَؤُوفٌ رَّحِيْم(حشر/۱۰)۔(۱۶)۔

تفسیر لکھنے کا سبب: مولانا ثناءاللہ رقمطراز ہیں کہ: ۱۔ میں نے دیکھا کہ مسلمان عموماً فہم قرآن سے ناواقف بلکہ شناخت حروف سے بھی نا آشنا ہیں ایسے وقت میں عربی تصانیف سے ان کا فائدہ اٹھانا تقریباً محال ہے۔۲۔ میں نے مخالفین پر غور کیا تو باوجود بے علمی اور ہیچ مدانی کے مدعی ہمہ دانی پایا، خدا کی پاک کتاب پر منہ کھول کھول کر معترض ہو رہے ہیں حالاں کہ کل سرمایہ ان کا سوائے تراجم اردو کے کچھ بھی نہیں۔۳۔ میں نے قرآن کو جامع علوم عقلیہ ونقلیہ بالخصوص علم مناظرہ میں امام پایا، دعوی پر دلیل ایسے ڈھپ کی ادا ہوتی ہے کہ ہر درجہ کا آدمی اس سے فائدہ اٹھا سکے، مگر جب تک حسب موقع شرح نہ کی جائے، [نہ صرف] عام بلکہ متوسط درجے کے خاص بھی فہم مطلب سے کما حقہ بہرہ ور نہیں ہو سکتے۔۴۔ میں نے بعض مقامات میں ردمخالفین کی طرز پر اور بعض جگہ نادان موافقین کے لیے جوابات لکھے ہیں سو الحمد للہ یہ تفسیر جیسی کہ زمانے کو ضرورت تھی ویسی ہی تیار ہوئی(۱۷)۔ مذکورہ عبارت سے مترشح ہے کہ مولانا کے مقاصد میں جہاں قرآنی آیات کی توضیح وتشریح مقصود تھی وہیں وقت کے مخالفین اسلام کا رد بھی شامل تھا۔

اس تفسیر کے بارے میں مولانا عبدالماجد دریابادی فرماتے ہیں کہ تفسیر ثنائی محدثین کے مذہب پر ہے، اور غیر مذاہب سے مناظرہ کرنے والوں کے لیے مفید ہے(۱۸)۔ گویا یہ تفسیر، تفسیر بالماثور پر مشتمل کتب تفاسیر میں سے ایک ہے، جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں سلف صالحین کے مسلک کی نمائندگی کی گئی ہے۔

طریقہ تفسیر: مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ نے اپنی اس تفسیر میں یہ اہتمام فرمایا ہے، کہ قرآن کی تفسیر قرآن کی آیات سے کی جائے، یہ انداز تفسیر یعنی تفسیر القرآن بالقرآن سب سے اعلی اور پسندیدہ ہے، چونکہ یہ کام کافی مشکل ہے ، اس لئے اس انداز کی تفاسیر بہت ہی کم لکھی گئی ہیں، خاص طور سے ہندوستان میں لکھی جانی والی تفاسیر میں اپنی نوعیت کی یہ عمدہ تفسیر ہے، اور یہ تفسیر نہ صرف ملک میں بلکہ بیرون ملک میں بھی بہت مشہور ہے۔

مولانا اپنی تفسیر کا تعارف کراتے ہوئے رقم طراز ہیں:

بے شک قرآن کریم حسب موقع نازل ہوتا رہا، اور بعد والے موقع کا اس کے پہلے موقعے سے، جس پر پہلی آیت اُتری تھی مطابق وموافق ہونا ضروری نہیں، مگر اس وجہ سے کہ سورتوں کی ترتیب آنحضرتؐ کے ارشاد سے ہوئی تھی تو کوئی نہ کوئی مناسبت لاحق کو سابق سے ضرور ہوگی، مانا کہ اتنی نہیں جو ایک ساتھ اترنے میں ہوتی، آخر میں فعل نبویؐ کا بھی تو کچھ استحقاق ہے اس لیے میں نے ایک آیت کو دوسری آیت سے جوڑ دیا اور تلاش کرنے سے کچھ نہ کچھ مناسبت بھی پائی (۱۹)۔

تفسیر الآیات بالآیات کی مثالیں :

تفسیر القرآن بالقرآن کا پہلا ماخذ خود قرآن کریم ہے، چنانچہ ایسا بکثرت ہوتا ہے، کہ کسی آیت میں کوئی بات مجمل اور تشریح طلب ہوتی ہے، تو خود قرآن کریم ہی کی کوئی دوسری آیت اس کے مفہوم کو واضح کردیتی ہے، اس لئے مولانا امرتسریؒ نے اپنی تفسیر ''تفسیر ثنائی'' کو کسی حد تک اسی نہج پر رقم فرمایا، چند مثالیں حسب ذیل ہیں:

۱۔اهدِنَــــا الصِّرَاطَ المُستَقِيم (فاتحہ/۵) مذکورہ آیت کے سلسلہ میں مولانا لکھتے ہیں کہ یہ بات واضح طور پر ثابت ہوتی ہے کہ دعا جب دل کی توجہ سے کی جائے تو ضرور ہی قبول ہوتی ہے، تائید میں یہ آیت پیش فرماتے ہیں: وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ (بقرہ/۱۸۶) (۲۰)۔

۲۔وَالَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ (انبیاء/۹۱) مذکورہ آیت کے باب میں مولانا امرتسری فرماتے ہیں کہ عام انسانوں کے لیے بھی یہی اضافت روح کی، اللہ کی طرف سے آئی ہے مولانا وضاحت میں یہ آیات پیش کرتے ہیں: الَّذِي أَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهُ وَبَدَأَ خَلْقَ الْإِنسَانِ مِن طِينٍ . ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهُ مِن سُلَالَةٍ مِّن مَّاءٍ مَّهِينٍ۔ ثُمَّ سَوَّاهُ وَنَفَخَ فِيهِ مِن رُّوحِهِ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْأَبْصَارَ وَالْأَفْئِدَةَ قَلِيلًا مَّا تَشْكُرُونَ (سجدہ/۷،۸،۹)۔

۳۔ذَلِكَ وَمَن يُعَظِّمْ حُرُمَاتِ اللَّهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ عِندَ رَبِّهِ وَأُحِلَّتْ لَكُمُ الْأَنْعَامُ إِلَّا مَا يُتْلَى عَلَيْكُمْ فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْأَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (حج/۳۰) مذکورہ آیت کے بارے میں مولانا رقمطراز ہیں کہ جانور انسان کے لیے حلال ہیں ان معدودے چند جانوروں کے سوا جن کی حرمت سورہ مائدہ میں آئی ہے جیسے: حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالْدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ لِغَيْرِ اللّهِ بِهِ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلاَّ مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَأَن تَسْتَقْسِمُواْ بِالأَزْلاَمِ ذَلِكُمْ فِسْقٌ الْيَوْمَ يَئِسَ الَّذِينَ كَفَرُواْ مِن دِينِكُمْ فَلاَ تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الإِسْلاَمَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِّإِثْمٍ فَإِنَّ اللّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ (مائدہ/۳) (۲۱)۔

۴۔وَلَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا وَلَدَيْنَا كِتَابٌ يَنطِقُ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ (مؤمنون/۶۲) مذکورہ آیت کے سیاق میں مولانا فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے پاس ایک کتاب بندوں کا اعمال نامہ ہے جو وقت پر قیامت کے روز سچائی کا اظہار کردیگی، جس کو دیکھ کر مجرم آہ وبکا کریں گے، تائید میں یہ آیت پیش فرماتے ہیں: وَوُضِعَ الْكِتَابُ فَتَرَى الْمُجْرِمِينَ مُشْفِقِينَ مِمَّا فِيهِ وَيَقُولُونَ يَا وَيْلَتَنَا مَالِ هَذَا الْكِتَابِ لَا يُغَادِرُ صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً إِلَّا أَحْصَاهَا وَوَجَدُوا مَا عَمِلُوا حَاضِرًا وَلَا يَظْلِمُ رَبُّكَ أَحَدًا (کہف/۴۹) (۲۲)۔

۵۔تَلْفَحُ وُجُوهَهُمُ النَّارُ وَهُمْ فِيهَا كَالِحُون (مؤمنون/۱۰۴) اس آیت کے ذیل میں مولانا فرماتے ہیں کہ وجوہ سے مراد صرف منہ ہی نہیں، بلکہ تمام بدن ہے، دلیل میں یہ آیت دیتے ہیں: إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُواْ بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَاراً كُلَّمَا نَضِجَتْ جُلُودُهُمْ بَدَّلْنَاهُمْ جُلُوداً غَيْرَهَا لِيَذُوقُواْ الْعَذَابَ إِنَّ اللّهَ كَانَ عَزِيزاً حَكِيما (نساء/۵۶)(۲۳)۔

۶۔وَاتَّخَذُوا مِن دُونِهِ آلِهَةً لَّا يَخْلُقُونَ شَيْئاً وَهُمْ يُخْلَقُونَ وَلَا يَمْلِكُونَ لِأَنفُسِهِمْ ضَرّاً وَلَا نَفْعاً وَلَا يَمْلِكُونَ مَوْتاً وَلَا حَيَاةً وَلَا نُشُوراً (فرقان/۳) اس آیت کے تعلق سے مولانا تحریر فرماتے ہیں کہ کسی کو بھی ان کاموں میں دخل نہیں، یہاں تک کہ اللہ نے اپنے نبیؐ کی ذات ستودہ صفات کی نسبت یہ کہا ہے جیسے: قُل لَّا أَمْلِكُ لِنَفْسِي نَفْعاً وَلَا ضَرّاً إِلَّا مَا شَاء اللّهُ وَلَوْ كُنتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ إِنْ أَنَاْ إِلَّا نَذِيرٌ وَبَشِيرٌ لِّقَوْمٍ يُؤْمِنُون (اعراف/۱۸۸)(۲۴)۔

۷۔وَإِلَى رَبِّكَ فَارْغَب (انشراح/۸) اس آیت کے تعلق سے مولانا لکھتے ہیں کہ آپؐ سے کہا جارہا ہے کہ اپنے پروردگار کی طرف ہمہ تن متوجہ ہوجانا، کیونکہ اس وقت دنیا سے آپؐ کے انتقال کا وقت آجائیگا پھر تفسیر القرآن بالقرآن کے حوالے سے یہ سورہ پیش فرماتے ہیں: إِذَا جَاء نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۔وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجاً ۔ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ إِنَّهُ كَانَ تَوَّاباً (نصر/۱تا۳)(۲۵)۔

۸۔إِذَا زُلْزِلَتِ الْأَرْضُ زِلْزَالَهَا (زلزال/۱) مذکورہ آیت کی توضیح میں مولانا کہتے ہیں کہ جب زمین غیر معمولی زور سے ہلائی جائے گی تو تمام اونچائی نیچائی سب برابر ہوجائیگی جیسے قرآن میں آیا ہے: لَا تَرَى فِيهَا عِوَجاً وَلَا أَمْتا (طہ/۱۰۷)(۲۶)۔

۹۔فَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْراً يَرَهُ ۔ وَمَن يَعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرّاً يَرَهُ (زلزال/۷،۸) مذکورہ آیات کے سیاق میں مولانا رقمطراز ہیں کہ قرآن میں اعمال بد معاف ہونے کے دو طریق آتے ہیں، شاہد میں یہ دو آیات پیش کرتے ہیں: قُل لِلَّذِينَ كَفَرُواْ إِن يَنتَهُواْ يُغَفَرْ لَهُم مَّا قَدْ سَلَفَ وَإِنْ يَعُودُواْ فَقَدْ مَضَتْ سُنَّةُ الأَوَّلِين (انفال/۳۸) وَأَقِمِ الصَّلاَةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفاً مِّنَ اللَّيْلِ إِنَّ الْحَسَنَاتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّئَاتِ ذَلِكَ ذِكْرَى لِلذَّاكِرِين (هود/۱۱۴)(۲۷)۔

۱۰۔وَقَدْ خَابَ مَن دَسَّاهَا (شمس/۱۰) مولانا اس آیت کے تحت لکھتے ہیں کہ انسانی نفس فطرتاً شرارت آمیز ہے اسی لیے ملائکہ نے کہا تھا: وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلاَئِكَةِ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الأَرْضِ خَلِيفَةً قَالُواْ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَاء وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ قَالَ إِنِّي أَعْلَمُ مَا لاَ تَعْلَمُون (بقرہ/۳۰)(۲۸)۔

۱۱۔وَوَجَدَكَ ضَالّاً فَهَدَى (ضحیٰ/۷) اس آیت کے متعلق مولانا کہتے ہیں کہ اللہ تعالی نے آپؐ سے کہا کہ تجھے دینی مسائل کی تفصیل سے بے خبر پایا تو رہنمائی کی، نظیر میں یہ آیت دیتے ہیں: وَكَذَلِكَ أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ رُوحاً مِّنْ أَمْرِنَا مَا كُنتَ تَدْرِي مَا الْكِتَابُ وَلَا الْإِيمَانُ وَلَكِن جَعَلْنَاهُ نُوراً نَّهْدِي بِهِ مَنْ نَّشَاء مِنْ عِبَادِنَا وَإِنَّكَ لَتَهْدِي إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيم (شوریٰ/۵۲)(۲۹)۔

خلاصہ: مولانا ثناءاللہ امرتسریؒ (۱۸۶۸ء۔۱۹۴۸ء) کی تفسیر "تفسیر ثنائی" سے مترشح ہے کہ اسمیں تفسیر الآیات بالآیات کا اہتمام کیا گیا ہے، یہ طرز تفسیر ایک مشکل ترین کام ہے کیونکہ تمام قرآنی آیات کا ہمہ وقت استحضار اور ان کے مفاہیم پر دسترس نیز ایک آیت کا ربط دوسری

آیت سے بھی اچھی طرح معلوم ہونا، کیونکہ اس کے بغیر ادائیگی مفہوم ناممکن ہے، بڑا مشکل ہے۔ ویسے تو قرآنی تفسیر کی اساس، قرآن ہی ہے، لیکن اس طرز کو اختیار کرتے ہوئے قرآن کریم کی مکمل تفسیر وتشریح ذرا مشکل ہے، خاص کر احکام اور مسائل کی، آیات کو اس طرح واضح کرنا کہ قارئین کے ذہن میں پوری بات اور مسئلہ مبرہن ہو جائے، یہ کام احادیث اور عقلی دلائل کے بغیر تقریباً ناممکن ہے، مذکورہ تفسیر میں کسی حد تک ان سب پہلوؤں کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔

حواله جات:

(۱) تفسیر ثنائی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، تصحیح وتقدیم مولانا مختار احمد ندوی، ۱/۱۰،۳۴، الدار السّلفیہ ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۰ء۔

قرآن مجید مع ثنائی ترجمہ، ترجمہ شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، تحشیہ مولانا محمد داوودزاد دہلویؒ، تقدیم مولانا محمد اسماعیل سلفیؒ (گوجرانوالہ) ص/۲۶ شائع کردہ قرآن اکیڈمی صفا شریعت کالج، ڈومریاگنج، سدھارتھ نگر یوپی۔ قرآن مجید مع تفسیر ثنائی ص/۸۳۴ ثناء اللہ امرتسریؒ۔ ثنائی اکیڈمی لاہور۔

(۲) ص/ ۸۳۴

(۳) تفسیر ثنائی، ص/۵۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری۔ ادارہ ترجمان السنہ لاہور۔

(۴) فضل الرحمان بن میاں محمد، ص/۳۶۔ دار الدعوۃ السّلفیہ لاہور۔

(۵) قرآن مجید مع تفسیر ثنائی، ص/۸۳۵ ثناء اللہ امرتسریؒ۔

(۶)

(۷) تفسیر ثنائی، مولانا ثناء اللہ امرتسری، ۱/۵۸، میر محمد، کتب خانہ آرام باغ کراچی، ۱۹۳۱ء۔

(۸) سیرت ثنائی، ص/۱۱۰ عبد المجید خادم، مکتبہ قدوسیہ لاہور۔

(۹) قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برسوں میں ص/۳۱۴، ۳۱۵ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۹ء۔

(۱۰) ہفتہ وار مجلّہ

(۱۱) قرآن مجید کی تفسیریں چودہ سو برسوں میں ص/۳۰۴ خدا بخش لائبریری، پٹنہ، ۱۹۸۹ء۔

(۱۲) اردو تفاسیر بیسویں صدی میں، ڈاکٹر سید شاہد علی، ص/۳۱، کتابی دنیا، دہلی ۲۰۰۹ء

(۱۳) (تفسیر ثنائی ۱۸۴/۸) (سیرت ثنائی ص/۲۴۷)

(۱۴) (تفسیر ثنائی، ۱۵/۱)

(۱۵) قرآنی معارف، مولانا محمد نظر علی خان، ص/۲۳۹، جلالی اکیڈمی دہلی، ۱۹۹۵ء

(۱۶) (تفسیر ثنائی، ۲۰/۱ آرام باغ کراچی) (تفسیر ثنائی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ تصحیح وتقدیم مولانا مختار احمد ندوی، ۵۸/۱، الدار السّلفیہ ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۰ء)

(۱۷) (تفسیر ثنائی، ص/۲ ثناء اللہ اکیڈمی دہلی ۱۹۷۹ء) (تفسیر ثنائی ص/۹، ۱۰، ادارہ ترجمان السنہ لاہور)

(۱۸) (ترجمہ وتفسیر مولانا دریا آبادی مطبوعہ تاج کمپنی، اگست ۱۹۵۲ء) (بہ حوالہ قرآنی معارف ص/۲۳۹)

(۱۹) تفسیر القرآن بکلام الرحمٰن، ثناء اللہ امرتسری، ص/۱۸ آفتاب برقی پریس امرتسر، ۱۹۲۹ء۔

تفسیر ثنائی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، تصحیح وتقدیم مولانا مختار احمد ندوی، ۵۳/۱، الدار السّلفیہ ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۰ء۔

(۲۰) تفسیر ثنائی، شیخ الاسلام مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ، تصحیح وتقدیم مولانا مختار احمد ندوی، ۵۶/۱، الدار السّلفیہ ممبئی، اکتوبر ۲۰۰۰ء۔

(۲۱) ۵۴۶/۲

(۲۲) ۵۸۴/۲

(۲۳) ۵۹۳/۲

(۲۴) ۶۳۹/۲

(۲۵) ۸۵۸/۳

(۲۶) ۸۷۰/۳

(۲۷) ۸۷۱/۳

(۲۸) ۸۵۰/۳

(۲۹) ۸۵۵/۳

☆☆☆

❑ تجزیہ

ترقی یا انحطاط اور تنزلی

مفتی رحمت اللہ ندوی

استاد: دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

ہم بار بار صنعتی ترقی، ٹکنالوجی ترقی، اور علمی اور سائنسی ترقی کا نام سنتے ہیں، اور مبہوت ہو جاتے ہیں، لیکن اس کی حقیقت جاننے کی کوشش نہیں کرتے کہ یہ ترقی کہیں انحطاط اور تنزلی تو نہیں، بعض لوگ کہتے ہیں کہ ترقی سے انکار کیوں کر ممکن ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور اس ماڈل کو سہولت و آرام، جدت و ایجادات اور سرعت ورفتار کے پیمانوں سے ناپئے! لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جو پیمانے ہمیں مغرب نے دئے ہیں وہی من وعن صحیح ہیں؟ ہمارے نزدیک، ترقی میں رفعت وبلندی ایک ناگزیر صنعت ہے۔ قرآن مجید میں مطالعاتی معجزہ کے تعلق سے ایک آیت کا ٹکڑا ہے، أو ترقی فی السماء (یا آپ آسمان پر چڑھ جائیں) (بنی اسرائیل:۹۳)۔

ترقی کے مفہوم میں یہ قدر بنیادی ہے اور جامع مفہوم ترقی کا یہ ہے کہ گزشتہ سے پیوستہ میں بلندی کی جانب پیش قدمی ہو لیکن اگر رفعت وبلندی کے بجائے نیچے کی طرف پیش قدمی ہونے لگے تو وہ ترقی نہیں بلکہ تنزل و انحطاط کہلائے گا، اور ظاہر ہے کہ نیچے کی جانب پیش قدمی میں رفتار زیادہ ہوئی ہے تو کیا سرعت کی وجہ سے انحطاط وتنزل ''ترقی'' بن سکتے ہیں؟ اسی طرح ''جدت'' بھی ترقی کی ایک اضافی صفت تو ہو سکتی ہے، بنیادی صفت نہیں، اور اگر جدت فطری توازن کو بگاڑ دے تو یہ بھی ترقی ہرگز نہیں مانی جاسکتی، کیوں کہ ہر نئی چیز ترقی کی علامت اور ترقی کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ رہی تیسری قدر یعنی ''سہولت یا آرام'' ترقی کی علامت اور اس کی ضامن ہوتی ہے تو عرض یہ ہے کہ اس کو بھی ترقی کے بنیادی مفہوم میں شامل نہیں ہونا چاہیے، کیوں کہ مثال کے طور پر ہمیں کسی آرام دہ اور ایرکنڈیشنڈ کمرہ میں تمام سہولیات دے دی جائیں، مگر اس میں زہریلی گیس کا خروج بھی ہو رہا ہو تو کیا وہ اس کمرہ میں ترقی کی علامت ہے یا ہلاکت وتنزلی کی؟ یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ موجودہ ترقی نے ہمیں بے شک آرام دہ اور ایرکنڈیشنڈ کمرے تو فراہم کئے ہیں مگر ان آرام دہ کمروں کے پیچھے ہماری اور آئندہ آنے والی نسلوں بلکہ حیاتیات عالم کی موت کے پروانے بٹ چکے ہیں، تو کون احمق ان کمروں میں رہے گا، اور وقتی آرام کے بعد بیماری ومصیبت کو ترقی ہی گردانتا رہے گا؟ ہاں! اگر یہی صفات جدت وجدیدیت اور آرام وسہولت بشمول سرعت، ہمیں ہماری صحت ومسرت اور سکون کی قیمت پر نہ ملیں تو ہم تسلیم کر لیں گے کہ بے شک ترقی ہوئی ہے، بعض لوگ کہہ سکتے ہیں کہ حقیقی ترقی تو بس ایک خیالی اور تصوراتی آئیڈیل (Utopia) ہے، جبکہ صنعتی انقلاب میں مادی ''ترقی'' سے انکار ممکن نہیں، بفرض محال ہم تھوڑی دیر کے لئے اسے تسلیم کر

لیں تو پھر اس ''عصری ماحولیاتی بحران'' کو ترقی کے کس خانہ میں رکھیں گے؟ کیا یہ بحران مادی سطح پر ظہور پذیر نہیں ہوا ہے؟ کیا یہ اس ٹکنالوجی کے عیب کا مظہر نہیں ہے؟ کیا یہ اس صنعتی انقلاب ہی کا نتیجہ نہیں ہے؟ کیا دو باتیں ایک ساتھ درست ہو سکتی ہیں کہ صنعتی انقلاب کے نتیجہ میں مادی ترقی بحیثیت ماحولیاتی بحران ہوئی؟ ہاں! اگر یہ بحران اخلاقی، روحانی، معاشرتی یا معاشی سطح ہی پر نمودار ہوتا تو اس کا مادی سطح پر اثر باعث اختلاف بن سکتا تھا، مگر یہ بحران تو خود مادیت کے علمبردار، مادیت کے پیمانوں سے ہی ناپ کر ہم تک پہنچا رہے ہیں۔ خلط مبحث نہ کریں بلکہ یہ سمجھیں کہ صنعتی ترقی اپنی جگہ اور موجودہ ماحولیاتی بحران کا مسئلہ اور اس کی سنگینی اپنی جگہ۔ کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ ماضی میں ترقی نہیں ہوئی، مگر ہم سے ''ماضی کی ناقص معلومات'' کو کسوٹی بنا کر ایک غیر معقول دلیل کو منوایا جا رہا ہے جبکہ ہماری دلیل یہ ہے کہ ہر زہر مضر ہے، چاہے ہمیں اس کے نقصان کا علم ہو یا نہ ہو، اور خواہ کتنی ہی خوبصورت اور لذیذ گولی کی شکل میں دیا جائے۔ ہم مابعد جدیدیت کے علمبرار نہیں کہ وقت کے ساتھ حقیقتوں کے بدلنے کے قائل ہوں، لہذا دلائل کی روشنی میں ہماری رائے یہ ہے کہ افراطِ مصنوعات بنام صنعتی ترقی، جدیدیت (Modernism) بنام جدت (Novelty) اور استحصال فطرت بنام سائنس، درحقیقت ترقی کے بجائے تنزلی اور کامیابی کے بجائے ناکامی (Failure) کے مظاہر تھے، اور ترقی کا یہ ماڈل روز اول ہی سے مضر، مصنوعی اور فلاپ (Flop) تھا۔

سرعت و تیز رفتاری، ترقی کی مغربی تعریف کا ایک بنیادی عنصر ہے، یہ نام نہاد ٹکنالوجیکل ترقی بیساکھیوں پر قائم ہے، وہ نہ صرف مغربی سائنس سے مستعار ہیں اور نہ صرف یورپ میں چرچ وعقلیت کی کشمکش کا نتیجہ ہیں، بلکہ براہ راست اس صنعتی انقلاب کی مرہون منت ہے، جس کی آبیاری عوام وخواص، سائنس داں وسیاست داں، حکومت و رعایا سبھی نے کی ہے، نیز اس مشینی صنعت اور مصنوعات کی مانگ اور کھپت کو مہمیز لگانے والے عوامل بھی اس کی رفتار میں اضافہ کر رہے تھے، جن میں ان مغربی فلسفوں اور نظریوں: اباحیت پرستی (Permissivism)، صارفیت (Consumerism) اور سرمایہ داری (Capitalism) کا اہم رول تھا۔ جب استحصال فطرت ہی ترقی کا معیار سمجھا جانے لگا تو کوالٹی کنٹرول کے پیمانے ہی الٹ گئے اور ان تمام تکنیکی سائنسی اور معاشرتی عوامل نے صنعتی ترقی کو تنزل کی طرف ڈھکیل دیا بلکہ وہ نام نہاد صنعتی ترقی ہی بنیادی کجی کی وجہ سے تنزلی کا سبب بن گئی۔

صنعتی انقلاب نے ماحول کو کثافت و آلودگی سے بھر دیا، فضا مسموم ہوگئی، اور طرح طرح کی بیماریاں وجود میں آرہی ہیں، صوتی آلودگی، آبی، زمینی، ہوائی آلودگیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ دنیا کے لئے اس آلودگی پر قابو پانا بہت مشکل نظر آرہا ہے، غذا کم، دوا زیادہ کھائی جارہی ہے، مختلف امراض کے گھیرے اور چنگل میں پھنسا انسان اب ان سے نجات اور چھٹکارا تلاش رہا ہے، لیکن ساحلِ نجات بہت دور اور راہِ نجات گم ہے۔

آج کل ایسی مشینیں ایجاد ہوگئی ہیں جو پہاڑوں کو کاٹتی اور سمندروں کو پاٹتی ہیں، کوہ سے دریا بہاتی ہیں، اور اسے ترقی کا معیار سمجھا جاتا ہے جبکہ زمین کا توازن قائم رکھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے پہاڑوں کو کیل اور میخ کے طور پر پیدا فرمایا ہے "وجعلنا الجبال اوتادا" قوم عاد وثمود کو اللہ تعالیٰ نے قد و قامت اور ڈیل ڈول کے لحاظ سے دیوہیکل بنایا تھا، وہ زمین کا توازن باقی رکھے ہوئے پہاڑوں کو تراش خراش کر گھر

اورٹھکانے بناتے تھے،"الذین جابو الصخر بالواد" ایک جگہ "وتنحتون الجبال بیوتا" کہا گیا ہے۔

موجودہ ترقی یافتہ دور میں گاؤ تکیہ کا استعمال خوشحالی کی علامت اور زندگی کا معیار تصور کیا جاتا ہے، اسی طرح چھری کانٹے سے کھانا تہذیب وتمدن کی نشانی سمجھی جاتی ہے جبکہ سورۂ یوسف میں ہمیں مصر کی تہذیب اور وہاں کا معیارِ حیات پہلے سے ہی یہی نظر آتا ہے، چنانچہ عزیز مصر کی بیوی نے جب اپنے بارے میں عورتوں کے اندر چرچا بہت زیادہ دیکھا تو سب کی دعوت کی اور گاؤ تکیے پیش کئے "وأعدت لهن متكأ" اور پھل کاٹنے کے لئے چھری دی "وآتت كل واحدة منهن سكينا" حضرت سلیمان علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ایسی سلطنت عطا فرمائی تھی کہ اس کی نظیر قیامت تک نہیں مل سکتی کیوں کہ انہوں نے خود دعا فرمائی تھی "رب هب لي ملكا لا ينبغي لأحد من بعدي" ان کے دور کی ترقی اور تمدن و خوشحالی، یا سائنس وٹکنالوجی جہاں تک پہنچی چکی تھی، آج اس کا تصور تو درکنار خواب وخیال بھی مشکل ہے، ہواؤں کے دوش پر چلتے اور مہینوں کا سفر صرف ایک دن میں طے کر لیتے، جنات جیسی مخلوق ان کے تابع فرمان تھی اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے حکم سے محراب، اسٹیچو، اور تالاب کی طرح لگن تیار کرتے "يعملون له ما يشاء من محارب وتماثيل وجفان كالجواب" سی بی آئی کا محکمہ اتنا مستحکم تھا کہ ھد ھد نامی پرندہ بالکل سچی پکی رپورٹ دے رہا ہے، نہ جھوٹ بولتا ہے، نہ غلط بیانی کرتا ہے، نہ ہی طاقت سے مرعوب ہوتا ہے اور نہ کسی دباؤ اور لالچ میں آتا ہے، یہ پرندہ لشکرِ سلیمان کے قیام کے لئے آبی جگہ تلاش کرتا ہے، تا کہ فوج کو پانی کی دشواری نہ ہو، نظم ونسق کا یہ عالم ہے کہ سب کی خبر گیری اور حاضری ہوتی ہے۔ اگر بظاہر کوئی غائب ہے تو تحقیق کی جاتی ہے اور اسے عذر پیش کرنے اور اپنی بات رکھنے کا موقع اور آزادی دی جاتی ہے۔ کثرت کے باوجود ڈسپلن نہیں بگڑتا، حتی کہ چیونٹی جیسی معمولی مخلوق کو بھی جینے کا حق دیا جاتا ہے۔ آج کی طرح پوری پوری آبادی اور شہر کو ڈائنامنٹ کر کے قبرستان میں تبدیل نہیں کیا جاتا ہے۔ آپ خود فیصلہ کریں کون سی ترقی بہتر تھی یا ہے، وہ دور زیادہ ترقی یافتہ تھا اور اس کی ایجادات واختراعات زیادہ مفید تھیں، جبکہ پورا نظام اپنی فطری حالت پر قائم تھا، یا آج کا مفروضہ اور مزعومہ ترقیاتی دور، جبکہ نہ معلوم کتنے لوگ فنا کے گھاٹ اتر گئے، اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے، پوری فضا زہر آلود، ہر شئ میں ملاوٹ، ہر نظام درہم برہم، انسانیت بلک اور سسک رہی ہے، دم توڑ رہی ہے، پوری دنیا خودغرضی اور خدا فراموشی میں مبتلا ہے، نہ چین ہے نہ سکون، نہ راحت ہے نہ آرام، نہ لذت ہے نہ مزہ۔ پھر بھی دعوی ہے ترقی کا، ذرا بھی انحطاط وتنزلی کا احساس نہیں، ترقی کا عفریت ایسا سوار ہے کہ ہر تخریب، تعمیر، ہر بربادی آبادی، ہر بدبختی، خوش بختی، ہر ناکامی، کامیابی، اور ہر پستی، بلندی نظر آتی ہے، ایسے لوگوں کا حال ساون کے اندھے جیسا ہے، جس کو ہر طرف ہریالی اور شادابی ہی نظر آتی ہے ۔

وائے ناکامی، متاع کارواں جاتا رہا
کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا

خواب دیکھنے اور خوابِ غفلت میں زندگی بسر کرنے کا نام ترقی اور کامیابی نہیں ہوسکتا، شیخ چلی کی طرح خیالی پلاؤ پکانے اور سنہرے خواب دیکھنے سے ترقی نہیں ہوتی، اس کے لئے ضرورت دانشمندی، ہوشمندی، منصوبہ بندی اور طویل جدوجہد اور قربانی دینے کی پڑتی ہے، تب جاکے ترقی ہوتی ہے ورنہ

ع نہ خدا ہی ملا، نہ وصال صنم

☆☆☆

❑ تجزیہ

میں الزام ان کو دیتا تھا...

ابوفہد، نئی دہلی

سقوطِ غرناطہ وبغداد اور سقوط دہلی ودکن کے سینکڑوں سال بعد جب ہم سقوطِ لیبیا وعراق اور سقوطِ حلب کے دور میں داخل ہو چکے ہیں تو ہمیں بہت ساری پریشان کن چیزوں، افکار، رد عمل اور پریشان خیالیوں کا سامنا ہے۔ اب حقیقت میں ہو یہ رہا ہے کہ ہمارے ہر عمل، ہر لفظ اور ہر خیال اور اظہار خیال کے ہر زاویئے کو زوال زدہ تاریخ سے جوڑ کر دیکھا جارہا ہے۔ اچانک ایک شخص کھڑا ہوتا ہے اور پکارنے لگتا ہے۔ مسلمانو! تم سجدوں میں پڑے ہو اور خدا تمہیں میدانِ کار کی طرف پکار رہا ہے۔ اسی اثنا میں ایک دوسرا سرپھرا کھڑا ہوتا ہے اور ہانک لگاتا ہے، لوگو! میدانِ کار سے نکلو اور میدانِ کارزار کی طرف آؤ، نہیں تو زوال کی یہ چادر جو تمہارے، دلوں، ذہنوں اور سروں پر تان دی گئی ہے وہ کبھی بھی رفع نہ کی جاسکے گی۔ کسی تیسرے کونے سے ایک اور شخص مرغ کی طرح صبح سویرے اٹھ جاتا ہے اور بانگ لگاتا ہے، لوگو! تم ایسے مباحث میں الجھے ہوئے ہو جن کا موجودہ سائنسی زمانے سے کوئی تعلق نہیں اور اسی لیے ایسا زوال تمہارا مقدر ہے جس کی ابتدا تمہارے پرکھوں نے دیکھی مگر انتہا تمہاری آخری نسل بھی نہیں دیکھ پائے گی۔

آج ہم زوال امت کی ایک طویل تاریخ سے گزر کر سقوطِ حلب کے ایسے پڑاؤ پر پہنچ گئے ہیں جہاں ہمارا حال یہ ہے کہ اب اگر ہم کھانستے بھی ہیں تو سرمئی نگاہ اور پارہ صفت دل ودماغ رکھنے والے بہت سارے لوگ اسے بھی ہمارے زوال کی ایک نشانی کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ایک صاحب کا ماننا تھا کہ لوگ نماز میں صفیں سیدھی نہیں رکھتے اور خاص اسی لیے وہ زوال کا شکار ہیں۔ ایک محترم بزرگ دانشور جن کا گزشتہ سال انتقال ہو گیا اب سے آٹھ دس سال قبل طلبائے مدارس کے ایک چھوٹے سے گروپ کو خطاب کررہے تھے، خطاب کے دوران انہوں نے زوال امت کا ذکر کیا اور فرمایا کہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ہم قلعہ بند ہو گئے ہیں۔ انہوں نے کسی خاص طبقہ کا نام تو نہیں لیا تھا مگر سیاق وسباق اور لہجہ بتا رہا تھا کہ موصوف کا اشارہ منبر ومحراب کے شہہ نشینوں اور سجادہ وخرقہ پوشوں کی طرف ہے۔ ایک طالب علم سے رہا نہ گیا اور اس نے سوال کر ڈالا کہ سوال یہ بھی ہے کہ دانشوروں نے کیا کیا ہے۔ یہ سوال محترم بزرگ کے لیے گرچہ غیر متوقع تھا پھر بھی ان کا تحمل دیدنی تھا اور انہوں نے سوال کی معنویت بلکہ کہئے کہ سوال کی تلخ سچائی تسلیم کیا۔ کیونکہ واقعہ تو یہی ہے کہ کیا تو کسی نے بھی کچھ نہیں۔ مگر لوگ بھی کیا کریں اپنی فطرت سے مجبور جو ہوتے ہیں۔ انسان کی بہت ساری ذلیل عادتوں میں سے ایک عادت یہ بھی ہے کہ وہ ہمیشہ دوسروں کی طرف ہی انگلی اٹھاتا ہے یہاں تک کہ بعض دفعہ خود اپنی غلطی کے حوالے سے بھی۔ یہاں جتنے لوگ ہیں اتنی ہی باتیں ہیں البتہ ایک بات جو سب میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ان سب کے نشانے پر مذہبی ایمانیات واخلاقیات کے حوالے سے پختہ مزاج ہیں۔ حال یہ ہے کہ الزام عائد کرنے والا خواہ کوئی بھی ہو، مذہبی یا غیر مذہبی، البتہ جس پر الزام

آئے گا وہ ہر حال میں مولوی یا مولوی نما فرد ہی ہوگا۔

سوشل سائٹس پر سرگرم لوگوں کو یہ ایک بڑا ہی نیک کام ہاتھ آ گیا ہے۔ وہ ہر اس عمل، قول اور حرکت کو سیدھے سیدھے زوال سے جوڑ رہے ہیں جوان کے دماغ کے ان خلیوں سے میچ نہیں کرتا جن کو انہوں نے اپنے طرح کے رنگ میں رنگ لیا ہے۔ اب چاہے یہ رنگ فرقہ پرستی کا رنگ ہو، یا تجدد پسندی کا، زبردستی اوڑھی ہوئی دانشوری کا رنگ ہو یا پھر دین بیزار نفسیات کے رنگ میں رنگا ہوا کوئی بھی پھیکا یا گہرا رنگ۔ اس نیک کام میں خود عالم دین بھی مصروف ہیں، صحافی بھی، ادیب بھی، سیاست داں بھی اور بہت سارے ہمارے نادان دوست بھی۔ غرض کہ جس سے بھی دو لائنیں لکھنا اور گھسیٹنا آ گئی ہیں وہ علمائے دین کو لعن طعن کرنا اپنا فرض منصبی سمجھنے لگا ہے۔ ابھی حلب کے حوالے سے کچھ لوگوں نے پوسٹس بنائیں۔ ذرا آپ ان کا رخ اور زاویۂ نگاہ دیکھیں۔ ان میں لکھا گیا ہے کہ ایک طرف حلب جل رہا ہے اور دوسری طرف علماء ایک دوسرے کے خلاف فتوے دینے اور الزام تراشی کرنے میں مصروف ہیں۔ ایک پوسٹ میں عید میلاد النبی پر ہونے والی بحث وتمحیص کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اور کہا گیا ہے کہ تم لوگ جشن کے صحیح یا غلط ہونے میں الجھے ہوئے ہو جبکہ دشمن تمہاری آخری اور فیصلہ کن شکست کا جشن منانے کی تیاری میں جٹا ہوا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایسی پوسٹ بنانے یا اس طرح کے کمنیٹس پاس کرنے والے خود اپنے گریبانوں میں کیوں جھانک کر نہیں دیکھتے۔ وہ خود کیا کر رہے ہیں۔ سرکاری وغیر سرکاری عصری جامعات میں کیا چل رہا ہے، پارلیمنٹ میں بیٹھے ہوئے پادری نما ہمارے یہ لیڈر کیوں تماشائی بنے ہوئے ہیں اور پروفیسرز کس طرح کی بحثوں میں مصروف ہیں۔ اکاؤنٹینٹ کیا کر رہا ہے اور تاجر کہاں آتا جاتا ہے۔ انہوں نے اسے اس طرح کیوں نہیں لکھا کہ ایک طرف حلب جل رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے ادیب اپنے افسانوں کے نسوانی کردار گھاٹن کا سراپا اتارنے میں مصروف ہیں۔ ایک طرف حلب جل رہا ہے اور دوسری طرف ہمارے پارلیمینٹیرین دعوتیں اڑانے اور اپنی اپنی پارٹی کے لیڈروں کی خصیہ برداری میں مصروف ہیں۔ حلب جل رہا ہے اور ہمارے شاعر بے معنی شعروں میں سر کھپا رہے ہیں آخر یہاں ہر چھوٹے بڑے قومی زوال کو ''زوال ورثس علماء'' ہی کے رنگ و روپ میں کیوں دیکھا جاتا ہے؟ ایک عرصہ قبل پڑوسی ملک میں کسی صاحب نے پوسٹ بنائی تھی کہ ''ہماری کوئی بھی یونیورسٹی دنیا کی سو اہم یونیورسٹیز میں اپنا نام درج نہیں کرا سکی۔ ایک طرف یہ صورت حال ہے اور دوسری طرف یہ جنونی علماء ہیں، کہ فقہی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں''۔ اب اس نادان دوست سے کوئی پوچھے کہ بھائی جو لوگ یونیورسٹیوں میں بیٹھے سگریٹ پر سگریٹ پھونکے جا رہے ہیں اور پھوکٹ میں لاکھوں روپے ماہانہ لیتے ہیں یہ ذمہ داری تو ان کی تھی نہ کہ علماء کی۔

ہمارے یہاں کا حال یہی ہے کہ اگر کسی کے گھر کے سامنے سے گزرنے والی نالی بند ہو جاتی ہے تو وہ اسی طرح کے کمینٹس کرتا ہے ''یہاں نالیاں بند پڑیں ہیں اور یہ ملاّ تین طلاق کی بحثوں میں الجھے ہوئے ہیں''۔ ایک دانشور صاحب اپنے ایک عمل کو فخر یہ بیان کر رہے تھے کہ ایک بار ان کے دروازے پر تبلیغ کے کچھ افراد آئے، وہ اندر سے جل بھن گئے۔ انہوں نے امیر جماعت کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو کھینچا۔ آیئے پہلے ہم یہ نالیاں صاف کرتے ہیں۔ یہاں نالیاں گندی پڑی ہیں اور آپ ہیں کہ دعوت وتبلیغ میں لگے ہوئے ہیں۔ آخر یہ کیوں لکھا جاتا ہے کہ بغداد پر ہلاکو خان چڑھائی کر رہا تھا اور بغداد کے مفتی وعلماء اس بحث میں الجھے ہوئے تھے کہ کوّا حلال ہے کہ حرام۔ جبکہ دیانت داری والی بات تو یہ ہے کہ بغداد کو بچانے کی ذمہ داری والیٔ بغداد پر زیادہ عائد ہوتی تھی، تو اس حوالے سے

یہ دیکھنا زیادہ ضروری تھا کہ خود والی بغداد، اس کے حوالی موالی اور سپاہی اس وقت کیا کررہے تھے۔ آخر آج تک کسی نے یہ کیوں نہیں لکھا یا کہا کہ ایک طرف دہلی جل رہی تھی اور دوسری طرف غالب شطرنج کی چالوں میں مگن تھے، ازار بند میں گرہیں لگارہے تھے۔

کل عراق اور لیبیا جل گئے اور آج حلب جل گیا، گجرات جل گیا اور میانمار میں خاک وخون کی ہولی کھیلی جارہی ہے اور دنیا کا ہر مسلمان اپنے روزمرہ کے کاموں میں مصروف ہے، ڈفلی بجانے والا ڈفلی بجارہا ہے، ریلیاں کرنے والا ریلیاں کررہا ہے، ناچنے والا ناچ رہا ہے اور گانے والا گارہا ہے۔ کرکٹ کھیلے والے کو اپنے بیٹ اور بال کی فکر ہے اور تاجر کو اپنا پیسہ دوگنا کرنے کی۔

جو افسانہ نگار ہیں وہ افسانے لکھ رہے ہیں، جو شاعر ہیں وہ نوعمر لڑکیوں کی پتلی کمر کی لفظی تصویر سو سو طرح سے بنارہے ہیں، جو صورت گر ہیں وہ ان کے جسم کے پوشیدہ حصوں کو زیادہ سے زیادہ نمایاں کرنے کی فکر میں رات دن گھلے اور مٹے جا رہے ہیں، جو ایکٹر، گلوکار اور اداکار ہیں وہ ناچ گارہے ہیں اور موج ومستی کے نئے نئے عناوین تلاشنے میں جٹے ہوئے ہیں جو ایڈیٹر ہیں وہ سفید کاغذ کو کالے کاغذ میں بدل رہے ہیں، بنیے اپنی تجوریوں کو بھرنے میں لگے ہوئے ہیں، کمپنیوں کو اپنا اپنا ٹرن اوور بڑھانے کی فکر لگی ہوئی ہے، ڈاکٹر زمریضوں کے دل گردے بیچ رہے ہیں اور جو جوان ہیں وہ دلہنوں کو حجلۂ عروسی کی طرف کھینچ رہے ہیں، جو لوَرز ہیں وہ پارکوں کی نرم گھاس پر ایک دوسرے کی جیب میں ہاتھ ڈالے چین کی بانسری بجارہے ہیں اور پارلیمنٹ میں دھینگا مشتی جاری ہے اور لال بتی کی گاڑیاں دنیا کے طول وعرض میں زندگی کی پنڈلیوں سے رس نچوڑنے کی فکر میں رات دن دندناتی پھر رہی ہیں، یہاں سب کچھ ہورہا ہے، مگر کسی پر کوئی الزام نہیں۔ الزام تو بس ایک بے چارے مولوی پر ہی عائد ہوتا ہے، مدرسوں پر ہوتا ہے اور ملی تنظیموں پر ہوتا ہے۔ باقی کوئی بھی ذمہ داری نہیں۔ اب چاہے وہ گلی کا غنڈہ ہو، ممبر پارلیمنٹ ہو، بادشاہ ہو، صدر ہو یا پی۔ ایم ہو۔

اس لعن طعن کے وہ لوگ زیادہ مستحق تھے اور ہیں جو سواد امت کے کالے وسفید کے مالک ہیں، جو ڈیڑھ سو سے زاید مسلم ممالک کے صدر، بادشاہ یا وزیراعظم ہیں۔ جن کے ہاتھوں میں سیاسی قوت ہے، جن کے اشاروں پر فوجوں کے دل کے دل حرکت کرتے ہیں، جو ایک عرب سے زائد مسلم آبادی کے حصے میں آنے والے قدرتی ذخائر پر بلاشرکتِ غیر قابض ہیں، جن کے پاس سیال سونے کے کنویں ہیں اور جن کے زمین دوز خفیہ ٹھکانوں میں ان گنت ایٹم بم آخری پوزیشن لیے ایستادہ ہیں، جو عالیشان محلوں اور قلعہ نما گھروں میں رہتے ہیں اور جن کے پاس پی. ایم. صدر جمہوریہ اور نائب صدر جمہوریہ سے لے کر ایم پی تک اور چانسلر و وائس چانسلر تک کے عہدے ہیں۔ لیکن پھر بھی پتہ نہیں کیوں ایسا ہے کہ قوم کے پچھڑے پن کی جب بات آتی ہے تو ہمیشہ ہی ایسا ہوتا ہے کہ نائب صدر جمہوریہ، پی. ایم. اور ڈالرز میں سرکاری تنخواہ پانے والوں کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جاتا؛ بلکہ اس کے بالکل ہی الٹ یہ ہوتا ہے کہ قوم کے کچھ بلغمی مزاج کے حامل افراد بلکہ لیڈر مسجد کی کج وپریشاں صفوں سے ایک نمازی کو اٹھالاتے ہیں اور کہتے ہیں دیکھو یہ ہے قوم کا سب سے زیادہ غیر ذمہ دار شخص، یہی وہ شخص ہے جس کی وجہ سے ہمارے ملی زوال کے تابوت میں آخری کیل ٹھونکی جائے گی۔

کیا ابھی وہ وقت نہیں آیا جب ہم اس روش کو بدلنے کی ضرورت پر غور وخوض کرنے کا آغاز کرسکیں گے۔؟؟

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

اختلاف کے ساتھ اتحاد

محمد خالد ضیاء صدیقی ندوی
امام بخاری ریسرچ اکیڈمی، علی گڑھ

دور حاضر میں جو مرض وبا کی طرح پھیل رہا ہے، اور جس کی لپیٹ میں عوام تو عوام، خواص بلکہ اخص الخواص طبقہ تک نظر آتا ہے وہ ہے " آپسی اختلاف "، اور یہ وہ آئینہ ہے جس میں انحطاط وتنزل کی ساری لکیریں ایک وسیع النظر مؤرخ کو واضح طور پر نظر آتی ہیں، جب ہم سلف کی زندگی کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہاں بھی اول وہلہ میں " اختلاف کا بدنما منظر " سامنے آتا ہے؛ لیکن تھوڑی سی گہری نظر ڈالتے ہیں تو اسی کے پہلو بہ پہلو " اتحاد کا خوشنما منظر " بھی ہمیں خوشگوار احساس دلائے بغیر نہیں رہتا۔ قدیم فرقوں میں اختلاف، جدید فرقوں سے اگر زیادہ نہ تھا، تو کم بھی نہ تھا، اگر آج ہم شیعہ، سنی، مقلد، غیر مقلد، اور وہابی، بدعتی کے مابین تکفیری توپوں کی گھن گرج سن رہے ہیں، تو کبھی جبریہ، معتزلہ اور جہمیہ بھی اسی طرح آپس میں ایک دوسرے پر تکفیری گولیدا غا کرتے تھے، کسی کو گمراہ ومرتد اور زندیق کہنا تو بقول شبلی نعمانی معمولی بات تھی......لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اس سخت اختلاف کے باوجود مشترکہ اغراض میں ان کے یہاں اتحاد کے حیرت انگیز نمونے بھی ملتے ہیں، ذیل میں ہم علامہ شبلی نعمانی کے ایک قیمتی مضمون کے چند منتخب حصے آپ کے سامنے پیش کرتے ہیں جن سے اندازہ ہوگا کہ اختلاف اور اتفاق کے حدود الگ الگ ہونے کے باوجود، دونوں کا اجتماع کیوں کر ممکن ہے؟

۱۔ محدثین، قدریہ، جبریہ، معتزلہ، شیعہ وغیرہ کو اہل بدعت اور اہل ہوا کہتے تھے، ان کو گمراہ سمجھتے تھے، باایں ہمہ دین کا نہایت اہم کام، یعنی حدیث کی روایت کرنا، ان سے جائز سمجھتے تھے، اکثر ائمہ حدیث کا فتوی یہی ہے کہ فرقہ ہائے باطلہ خطابیہ کے سوا، جن کے مذہب میں جھوٹ بولنا جائز ہے سے حدیث روایت کرنا جائز ہے، ابن حبان کا قول ہے:

ہمارے ائمہ میں سے محدثین کے نزدیک اس امر میں کوئی اختلاف نہیں ہے کہ اگر (راوی) راست گو، صاحب حافظہ بدعتی ہو؛ لیکن اپنی بدعت کی طرف لوگوں کو بلاتا نہ ہو، تو اس کی روایات سے دلیل لانا جائز ہے۔ علامہ ابن صلاح کا قول ہے: محدثین کی تصنیفات غیر داعی بدعتیوں کی روایت سے پر ہیں۔ ابراہیم بن یحیی امام شافعی رحمہ اللہ علیہ کے استاذ تھے، ان کا مذہب قدری تھا، اس لیے امام شافعی جب ان سے روایت کرتے تھے تو کہتے تھے کہ: یہ مجھ سے ایسے شخص نے روایت کی ہے جس کا دین مشکوک ہے؛ لیکن روایت صحیح کرتا ہے۔

ان اقوال وامثلہ پر تبصرہ کرتے ہوئے علامہ شبلی لکھتے ہیں:
''محدثین کی یہ انتہا درجے کی نکتہ سنجی، حقیقت شناسی اور بے تعصبی ہے کہ وہ عقیدے کے لحاظ سے ایک شخص کو بدعقیدہ، بدعتی، گمراہ سمجھتے ہیں؛ لیکن اگر ان کے تجربے نے ثابت کردیا ہے کہ وہ شخص جھوٹ نہیں بولتا، تو اس سے بے تکلف حدیث سیکھتے ہیں، روایت کرتے ہیں، اس کی شاگردی کا اعتراف کرتے ہیں''۔

۲۔ اسی اصول (اختلاف کے ساتھ اتحاد) کا یہ نتیجہ تھا کہ نصاب تعلیم میں مخالف فرقہ کے لوگوں کی مذہبی کتابیں بھی داخل تھیں (اور آج بھی ہیں)، ہر شخص جانتا ہے کہ زمخشری معتزلی تھا، تاہم تفسیر کشاف ابتدا سے آج تک ہمارے علما کے درس اور مطالعے میں رہی، علما کو یقین تھا کہ ادب، عربیت، معانی وبلاغت کے لحاظ سے یہ کتاب لاجواب ہے؛ اس لیے اس کی عام خوبی سے انکار نہیں کرسکتے تھے، البتہ جہاں جہاں زمخشری نے اپنے عقائد کا اظہار کیا ہے، وہاں تنبیہ کردیتے تھے کہ یہ معتزلہ کے عقائد ہیں۔

۳۔ عقلی اور ادبی علوم میں اختلاف عقائد کا مطلق اثر نہ تھا،

علوم عقلیہ میں جولوگ امام فن مانے جاتے ہیں، تقریباً آج کل کے نقطہ نظر سے خارج المذہب اور کم از کم فاسد العقیدہ تھے، فارابی، اور بوعلی سینا افلاک کو قدیم مانتے تھے، محقق "طوسی" غالی شیعہ تھے، فن بلاغت کے تمام ارکان یعنی جاحظ، عبدالقادر جرجانی، سکاکی، معتزلی تھے، نحو کا سب سے اعلی درجے کا مصنف "رضی" شیعہ ہے...... باایں ہمہ تمام اہل سنت و جماعت انہی کتابوں کو پڑھتے، پڑھاتے اور انہی کو اپنا ماخذ اور مرجع قرار دیتے آئے، اور ان کے مصنفوں کے نام کے بجائے ان کو شیخ، محقق، معلم ثانی، امام کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔

۴۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ اہل سنت و جماعت مخالفین مذہب کے پیچھے نماز پڑھنا جائز سمجھتے تھے اور پڑھتے تھے، گو بعض لوگوں نے مخالفت بھی کی؛ لیکن عام فتوی یہی رہا کہ سب کے پیچھے نماز جائز ہے .... مشہور محدث امام نووی رحمہ اللہ علیہ نے لکھا ہے: سلف اور خلف کا اس بات پر اتفاق رہا کہ معتزلہ وغیرہ کے پیچھے نماز پڑھنا جائز ہے۔(مقالات شبلی)۔

کیا سلف کا مذکورہ بالا عمل ہمارے لیے مشعل راہ اور پیغام عمل نہیں ہے؟ موجودہ سنگین صورتحال میں امت مسلمہ کا مختلف حلقوں میں بٹے رہنا، بلکہ اس کو بانٹتے رہنا کہاں کی دانشمندی اور کس عقل کی نشانی ہے؟۔

شکوہ امت کے عوام سے نہیں خواص سے ہے، جو عوام کو اپنے قول و عمل سے "تفرقہ بازی" کی تعلیم دیتے رہتے ہیں..! کہاں گئی یہ امت؟! اسے اب امت بھی کیوں کہیے؟!!

ہر مکتب فکر کے وابستگان جب یہ راگ الاپنے لگیں کہ حق بس انہی کے اندر منحصر ہے تو "حق" کا وجود بس "عنقا" سمجھیے !!......

واضح رہے کہ ہر "افتراق" مذموم نہیں ہے؛ بلکہ مذموم بقول مولانا بدر عالم میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ وہ اختلاف ہے جس سے ملت کی ہیئت اجتماعیہ پارہ پارہ ہوجائے، محبت ومودت، تعاون وتناصر، ہمدردی وسازگاری کے سارے رشتے ٹوٹ جائیں اور جماعتی شیرازہ اوراق پریشاں کی طرح منتشر ہوجائے"۔(ترجمان السنہ)

افسوس اس کا نہیں ہے کہ مقلدین کا غیر مقلدین سے اختلاف ہے، گرچہ یہ اختلاف بھی اگر سب وشتم اور تحزب وتعصب کی حد کو چھو جائے تو مزاج شریعت سے دور کہلائے گا، رونا تو اس کا ہے کہ بسااوقات "حضرات مقلدین" بھی فروعی اختلاف کو اس قدر ہوا دیتے ہیں کہ "پارٹی بندی" کی بدبو سے اتحاد کا پیارا چمن اپنی ناک بند کر لیتا ہے......افسوس صد افسوس کہ جو اختلاف، سرے سے اختلاف ہی نہ تھا، اپنے مسلک کی ترجمانی میں غلو کی حد تک پہنچ جانے سے وہ بھی جنگ وجدال کا اکھاڑہ بن گیا ...... مفتی شفیع صاحب عثمانی علیہ الرحمہ بہت پہلے لکھ گئے ہیں کہ: "ائمہ مجتہدین سب برحق ہیں، ان میں سے کسی ایک کو تقلید کے لیے معین کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس امام معین کی تقلید کسی نے اختیار کی ہے اس کے نزدیک دوسرے ائمہ قابل تقلید نہیں، بلکہ اپنی صواب دید اور اپنی سہولت جس امام کی تقلید میں دیکھی اس کو اختیار کرلیا، اور دوسرے ائمہ کو بھی واجب الاحترام سمجھا...... حنفی، شافعی، مالکی، حنبلی کی جو تقسیم امت میں قائم ہوئی، اس کی حقیقت اس سے زائد کچھ نہ تھی، اس میں فرقہ بندی اور گروہ بندی کا رنگ، اور باہمی جدال وشقاق کی گرم بازاری نہ کوئی دینی کام ہے، نہ کبھی اہل بصیرت علما نے اسے اچھا سمجھا ہے، بعض علما کے کلام میں علمی بحث وتحقیق نے مناظرانہ رنگ اختیار کرلیا، اور بعد میں طعن وطنز تک نوبت آگئی، پھر جاہلانہ جنگ وجدال نے وہ نوبت پہنچادی جو آج عموماً دین داری اور مذہب پسندی کا نشان بن گیا، فالی اللہ المشتکی"(معارف القرآن، سورۃ النحل)۔

اے عالم اختلاف میں رہنے والو! اختلاف کو باقی رکھتے ہوئے اتحاد کو اپناؤ......اختلافِ حق وباطل تو روز اول سے جاری ہے، اور صبح قیامت تک جاری رہے گا، لیکن دلوں میں آتش بغض وعداوت اگر بھڑک گئی، تو اسے بجھائے بغیر دخول جنت کا پروانہ بھی نہ ملے گا۔

کیا صحابہ کرام میں جزئیات کا اختلاف نہ تھا؟......لیکن یہ بھی تو بتاؤ کہ ان کے اختلاف کا رنگ پھیکا تھا یا پختہ؟۔

کیا یہ سچ نہیں کہ انہوں نے آپس میں فروعی اختلافات کو باقی رکھتے ہوئے، اخوت اسلامی، نصح وخیر خواہی، اور محبت ومودت کی ایسی سچی مثال قائم کی کہ آج تک کوئی جماعت اس کو چیلینج نہ کرسکی؟

ہیں جذب باہمی سے قائم نظام سارے
پوشیدہ ہے یہ نکتہ تاروں کی زندگی میں

☆☆☆

❑ نقطۂ نظر

میرے ووٹ دینے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟

محفوظ الرحمٰن انصاری، ممبئی

''میرے ووٹ دینے سے کیا فرق پڑ جائے گا؟ کوئی بھی سرکار آجائے حالات نہیں بدلیں گے، سب یونہی چلتا رہے گا۔اس لئے میں ووٹ نہیں دوں گا'' یہ وہ جملے ہیں جو الیکشن کے وقت مسلم علاقوں میں اکثر سننے کو ملتے ہیں۔ایسے لوگوں کی موجودہ حالات دیکھنے کے بعد آنکھیں کھل جانی، اور خیالات بدل جانے چاہئیں۔2014 میں ووٹ کی اکثریت سے جو سرکار مرکز میں آئی اس نے ایسے حالات بدلے کہ سب کچھ بدل کر رہ گیا۔بے روزگاری، مہنگائی اور عدم برداشت کو چھوڑ بھی دیں تو اس سرکار کے راج میں انصاف کا پیمانہ ایسا بدلا کہ انسانوں کو مارنا معمولی جرم، مگر گائے کے بچھڑوں کو مارنا سب سے بڑا جرم بن گیا۔ایسی سرکار ووٹوں کی بدولت ہی تو ملک پر مسلط ہوئی ہے۔ووٹ کی بدولت اچھی عوامی سرکار بھی بنتی ہے اور ظالم سرکار بھی۔انصاف قائم کرنے والی بھی اور انصاف کا خون کرنے والی بھی۔مثال کے طور پر بہار سرکار بنی تو اس نے شراب پر پابندی لگادی اور مہاراشٹر میں سرکار بنی تو اس نے بیل کے ذبیحے حتیٰ کہ قربانی تک پر پابندی لگادی۔بہار سرکار نے شراب پر پابندی لگا کر کئی گھرانوں کو برباد ہونے سے بچالیا تو مہاراشٹر سرکار نے بیل بچھڑوں کے ذبیحے پر پابندی لگا کر کسانوں، چمڑے اور گوشت کے کاروبار کرنے والے اور اس صنعت کے ذریعہ روزگار حاصل کرنے والے گھرانوں کو برباد کردیا۔شراب بندی سے جرائم اور گھریلو تشدد میں کمی آئی تو بیل کے ذبیحہ پر پابندی سے بے روزگار ہونے والے آگے کیا کریں گے؟اس کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

دوسری مثال تلنگانہ اور ہریانہ کی ہے۔تلنگانہ سرکار اقلیتوں کو ان کا جمہوری حق دینے کی کوشش کررہی ہے تو ہریانہ سرکار اقلیتوں کو ہراساں کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہی ہے۔تلنگانہ میں سرکار کی جانب سے رمضان المبارک کے مہینے میں مسلمانوں کو افطار کی دعوت دی گئی تو ہریانہ سرکار مسلمانوں کے کھانے میں بیف تلاش کرنے لگی۔تلنگانہ سرکار نے رمضان المبارک کے مہینے میں مسلم ملازمین کو جلد چھٹی دینے کا حکم جاری کیا اور مساجد کے اسٹاف کو تنخواہیں جاری کیں۔وہیں ہریانہ سرکار سرکاری اسکولوں اور محکموں میں سوریہ نمسکار کو لازم قرار دے کر مسلمانوں کو شرک کرنے پر مجبور کررہی ہے۔آنجہانی جیاللیتا کی غریب پرور حکومت کا بھی یہاں ذکر کرنا ضروری ہے جنھوں نے اماموں کے لئے دو ہزار روپے ماہانہ وظیفہ مقرر کیا۔بیواؤں کے لئے ایک ہزار ماہانہ مقرر کیا۔اس کے علاوہ غریب مسلم لڑکیوں کی شادی کے لئے پچاس ہزار کی رقم کے ساتھ چالیس گرام سونے کے زیورات بھی مہیا کئے جاتے ہیں۔علاوہ ازیں تمل ناڈو میں ہر گلی میں اماں کینٹین قائم کئے جہاں پانچ روپے میں پیٹ بھر کر کھانا ملتا

ہے۔ اب کچھ اور سمجھانے کی ضرورت نہیں کہ اچھی اور بری سرکاریں اور حالات کی تبدیلی ووٹوں کی بدولت ہی وجود میں آئی ہیں۔اس لئے اپنے ووٹ کی قیمت کو پہچانیں۔1999 میں اٹل بہاری واجپئی کی تیرہ ماہ پرانی سرکار سیف الدین سوز کے محض ایک ووٹ کی وجہ سے گرگئی تھی۔اس لئے ایک ووٹ بھی قیمتی ہے۔

مسلم ووٹوں کی اہمیت کوفرقہ پرست اچھی طرح جانتے ہیں تبھی تومسلم اکثریتی علاقوں میں ووٹرلسٹ میں نام غائب ہونے اور گڑ بڑی کے معاملات سامنے آتے رہتے ہیں۔پچھلی مرتبہ پارلیمانی حلقوں کی حد بندی ہوئی ہے اس نے جنوبی ممبئ پارلیمانی حلقے کومسلم اکثریتی حلقہ بنادیاہے۔اس میں محمد علی روڈ، بھنڈی بازار، ڈونگری، مجگاؤں، ناگپاڑہ، مدنپورہ، جیجاماتا نگر جیسے کثیر مسلم آبادی والے علاقے شامل ہوگئے ہیں۔اگر اس حلقہ میں مسلمان متحد ہوکراسی فیصد ووٹنگ کریں تو انشاءاللہ مسلم امیدوار پارلیمنٹ میں بھیجا جاسکتا ہے۔2019 کی تیاری متحد ہوکر ابھی سے شروع کریں تو یہ مشکل بھی نہیں ہے۔اس ضمن میں کثیر مسلم آبادی والے بھیونڈی کے ووٹروں سے عرض ہے کہ خدارا اپنا رویہ بدلیں ،تب ہی آپ کا شہر بدلے گا۔بھیونڈی کے بارے میں خود اہل بھیونڈی کہتے ہیں کہ یہاں پیسے لے کر ووٹ دینے کا مزاج عام ہے۔اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں گندگی، مچھر، آوارہ کتوں ،ٹوٹی پھوٹی بدترین سڑکیں بدحال سرکاری ہسپتال ان کا مقدر ہیں۔جس نمائندے نے پیسے دے کر ووٹ خریدے ہوں گے وہ کیوں ترقیاتی و فلاحی کاموں پر پیسہ خرچ کرے گا۔بغیر پیسہ لئے بیداری کا ثبوت دیتے ہوئے بھرپور ووٹنگ کریں اور مخلص اور عوام دوست نمائندہ منتخب کریں،اور پھر اپنے اس نمائندے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اپنے مطالبات منوائیں۔ساتھ ہی مسلمانوں کو چاہئے کہ اپنے مسلم قائدین پر بھروسہ بھی کریں ،کان کے کچے نہ بنیں۔مایاوتی چاہے بی جے پی یا کانگریس سے ہاتھ ملائیں دلت ان پر بھروسہ کرتے ہوئے ہمیشہ ان کے پیچھے کھڑے رہتے ہیں۔مگر ہم اپنے قائد پر اتنا شک وشبہ کریں گے اور ذرا ذراسی بات پر بدظن ہوجائیں گے تو مسلم قیادت کیسے مضبوط ہو پائے گی۔15اکتوبر کوممبئ کے ناگپاڑہ پر ہونے والے مسلم مجلس مشاورت کے جلسہ میں ڈاکٹر امبیڈکر کے پوتے پرکاش امبیڈکر نے شکایت بھی کی کہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ لانے اور ان کے مسائل اٹھانے کے لئے ہم کس مسلم لیڈر سے رابطہ کریں ؟کوئی تو مسلم لیڈر سامنے ہونا چاہئے۔اگر کسی کومسلم لیڈر مان کر ہم اس سے بات شروع کرتے ہیں تو چند مہینوں بعد کچھ دوسرے مسلم لوگ سامنے آکر اس کی مخالفت کرتے ہیں اور خود کو مسلمانوں کا قائد بتاتے ہیں۔ایسی کشمکش والی الجھن بھری صورتحال ختم ہونی چاہئے۔آخری بات یہ ہے کہ اگر الیکشن کے وقت متحد ہونا ہے تو باقی کے پانچ سال بھی مسلمانوں کو متحد رہنا چاہئے۔ہمیشہ مسلک بازی کے جھگڑوں میں پڑے رہنے سے سیاسی اتحاد بھی متاثر ہوتا ہے۔حتیٰ کہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ کچھ مسلمان کسی غیر مسلم کوتو ووٹ دے دیتے ہیں مگر مسلم امیدوار کے سامنے آتے ہی اس کا مسلک دیکھ کر بدکنے لگتے ہیں۔ایسی ذہنیت کو بدلنے کی ضرورت ہے۔فرقہ پرستوں کو ووٹ سے چوٹ دیں۔ضعیفوں اور خواتین کو لانے لے جانے کا انتظام کرکے سو فیصد ووٹ کرائیں۔یہ ہمارا دستوری حق بھی ہے اور جمہوری ہتھیار بھی۔

☆☆☆

❑ احساس ذمہ داری

اسلامی شریعت کے بارے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا بنیادی سبب اور علماء کرام کی ذمہ داری

محمد مجاہد ندوی، صدر اسلامک اسٹڈیز ارقم پبلک اسکول مہاراشٹر، انڈیا
Emil: mmujahidnadwi99@gmail.com

۳؍دسمبر ۲۰۱۶ء کو شام میں راقم الحروف کو ٹائمس آف انڈیا کی ایک نامہ نگار (reporter) محترمہ جویریہ خان کا فون آیا۔ وہ مجھ سے طلاق ثلاثہ، تعدد ازدواج اور اسلام میں خواتین کے حقوق وغیرہ سے متعلق چند سوالات پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ انہوں نے بتایا کہ اصل میں مجھے یہ سوالات پوچھنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کہ یہاں ناگپور میں مسلم خواتین کا ایک دوروزہ ورک شاپ تھا جس کو ''مسلم مہیلا منچ'' نے منعقد کیا تھا، اس ورک شاپ میں ناگپور اور اس کے اطراف سے بہت سی خواتین نے شرکت کی۔ ٹائمس آپ انڈیا کی جانب سے مجھے اس ورک شاپ میں شرکت کرنے اور اس کی رپورٹ تیار کرنے کی ذمہ داری دی گئی تھی۔ انہوں نے مزید بتایا کہ ورک شاپ میں ''مسلم مہیلا منچ'' کی خواتین چند طلاق شدہ خواتین کو اپنے ساتھ لائی تھیں جن کی مظلومیت کی کہانی سناتے ہوئے ان خواتین نے طلاق ثلاثہ، تعدد ازدواج اور خواتین سے متعلق اسلامی شریعت کے دیگر احکام پر بہت سے لغو اور بے بنیاد تبصرے شروع کردئے۔ مجھے ان کی بہت سی باتیں مناسب نہیں لگ رہی تھیں، لہذا میں نے مناسب سمجھا کہ آپ سے اس بارے میں کچھ سوالات کیے جائیں۔ پھر انہوں نے مجھ سے اس حوالے سے چند سوالات کیے۔

راقم الحروف نے ان کے سوالات کا ترتیب وار جواب دیا، نیز اسلام میں طلاق ثلاثہ اور تعدد ازدواج وغیرہ کی جو حکمتیں ہیں ان کو بھی مختصراً بیان کیا، اور بتایا کہ اسلام ہی عورتوں کے حقوق کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ میری باتوں سے وہ محترمہ کچھ حد تک مطمئن ہوگئیں۔ انہوں نے کہا کہ ''مجھے لگتا ہے کہ مسلم خواتین میں شریعت کے بارے میں جو غلط فہمیاں پیدا ہورہی ہیں یا پیدا کی جارہی ہیں اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ لوگ اسلامی شریعت سے واقف نہیں ہیں۔ خاص طور سے مسلم خواتین کی معلومات شریعت کے بارے میں تقریباً صفر ہے۔ اگر اسلامی شریعت اتنی معقول ہے اور اس کی تعلیمات اتنی خوبصورت ہیں اور اس میں خواتین کے حقوق کا اتنا زیادہ پاس وخیال رکھا گیا ہے، اگر یہ تمام باتیں خواتین کے سامنے معقول اور مدلل انداز میں آجائیں تو میری رائے میں اکثر خواتین کی غلط فہمیاں دور ہوسکتی ہیں اور ساتھ ہی میڈیا کے پروپیگنڈے اور شریعت کے متعلق اس کی پھیلائی گئی گمراہیوں کا بھی سدباب ہوسکے گا۔ راقم نے محترمہ کی بات سے پورا اتفاق کیا اور سلسلۂ گفتگو منقطع ہوگیا۔

شریعت اسلامی کے بارے میں غلط فہمی کے اسباب: یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ موجودہ دور میں اسلامی شریعت، اسلامی اصطلاحات اور تعلیمات کے بارے میں جہاں غیر مسلموں میں بے شمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، وہاں مسلمانوں کی بھی ایک بڑی تعداد غلط فہمیوں کی شکار ہے۔ شریعت کا لفظ جتنا عام ہے اتنا ہی اس کے بارے میں غلط فہمیاں عام ہیں۔ غیر مسلم تعلیم یافتہ حضرات کا ایک بہت بڑا طبقہ شریعت کو چند ازکار رفتہ قدیم قبائلی روایات کا ایک مجموعہ سمجھتا ہے۔ اسی طرح

بعض حضرات کے خیال میں شریعت دور وسطی کا ایک مذہبی نظام ہے جواب اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ان حضرات کے خیال میں دنیا اب روشن خیالی کے دور میں داخل ہو چکی ہے۔ دور وسطی کے اس نظام کوموجودہ روشن خیال دنیا پر نافذ کرنے کی مانگ کرنا محض بے عقلی ہے۔شریعت کے بارے میں کچھ اور غلط فہمیاں وہ ہیں جو مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔جدید تعلیم یافتہ حضرات کی ایک بڑی تعداد کی نظر میں شریعت کی حیثیت یورپ کے دور تاریک کے مقدس رومن امپائر کے نظام اور قوانین سے مختلف نہیں۔اسی طرح عوام الناس اور بالخصوص خواتین میں بھی شریعت کے بارے میں بے شمار غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں۔

موجودہ دور میں پائی جانے والی ان غلط فہمیوں کا ایک بڑا سبب عالمی ذرائع ابلاغ کے پروپیگنڈے اور مغربی مصنفین کی جانب سے پھیلائی گئی بے بنیاد باتوں کو دخل ہے۔ انہوں نے مختلف زمانوں میں اپنے مختلف اغراض و مقاصد کے پیش نظر شریعت کی بہت سی اصطلاحات کو نشانہ بنایا اور شکوک وشبہات پیدا کیے۔چنانچہ ڈاکٹر محمود احمد غازی لکھتے ہیں:

''موجودہ دور میں اسلام کی بہت سی اصطلاحات وتعلیمات کے بارے میں غلط فہمیوں کا ایک ہمہ گیر سیلاب اٹھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔گذشتہ دوڈھائی سو سال کے دوران جب سے دنیائے اسلام کا براہ راست واسطہ استعماری قوتوں سے پڑا ہے اس وقت سے یہ غلط فہمیاں پیدا ہو رہی ہیں، بلکہ بالارادہ پیدا کی جارہی ہیں۔جس زمانے میں جو غلط فہمی پیدا ہوتی ہے اس زمانے کے سیاسی حالات پر نظر ڈالی جائے تو اس غلط فہمی کے اسباب اور محرکات بہت آسانی سے سامنے آجاتے ہیں۔مثال کے طور پر جب اٹھارویں صدی کے وسط میں دنیائے اسلام کے بیشتر ممالک مغربی استعمار کے توسیعی ہدف کا نشانہ بنے تو ہر جگہ مغربی طاقتوں کو مجاہدین اسلام کی شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ان حالات میں مغربی مصنفین نے جہاد اور مجاہدین کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرنا ضروری سمجھا، اس زمانے سے مغربی اہل قلم اور ان کے مشرقی عقیدت مند جہاد کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرتے آرہے ہیں۔

اسی طرح جب مغربی استعمار کے جلو میں عیسائی پادریوں کی بڑی تعداد دنیائے اسلام میں وارد ہوئی اور مسلمانوں کو مرتد کرنے کی مساعی زور وشور سے شروع ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی یہ کوششیں سراسر ناکامی کا شکار ہو رہی ہیں۔انہوں نے اس ناکامی کے اسباب پر غور کیا تو ان کو احساس ہوا کہ مسلمانوں میں اسلام کو ترک کر کے کسی اور مذہب کو اختیار کر لینا انتہائی معیوب سمجھا جاتا ہے۔یہ بات نہ صرف معاشرتی سطح پر انتہائی ناپسندیدہ سمجھی جاتی ہے جس کے نتیجہ میں ارتداد اختیار کرنے والا اپنے معاشرے سے مکمل طور پر کٹ جاتا ہے، بلکہ یہ حرکت ایک سنگین فوجداری جرم کی حیثیت بھی رکھتی ہے، جس کی سزا فقہ اسلامی کی رو سے موت ہے۔مغربی اہل علم نے جب سے اس بات کا احساس کیا اس وقت سے اپنا یہ فرض قرار دے دیا کہ سزائے ارتداد کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کرتے جائیں اور ایسے ایسے سوالات، شبہات اور اعتراضات اٹھاتے چلے جائیں جو مسلم معاشرے میں پیدا نہیں ہونے چاہییں۔

اسی طرح جب انیسویں صدی کے اواخر سے یہ بات محسوس ہونا شروع ہوئی کہ اب سلطنت عثمانیہ کا زوال اپنی آخری حدوں کو پہونچنے والا ہے اس وقت سے مغربی طاقتوں کے درمیان جہاں یہ مسابقت شروع ہوئی کہ سلطنت عثمانیہ کے مقبوضات پر کون قابض ہو وہاں یہ دوڑ بھی شروع ہوئی کہ خود ادارۂ خلافت کو بھی بدنام کیا جائے، خلافت کو مسلمانوں کے مسائل اور مشکلات کا سبب قرار دیا جائے، عرب مسلمانوں کے دلوں میں ترکوں کے خلاف مخالفانہ جذبات پیدا کئے جائیں اور مسلمانوں کی وحدت اور ملی یک جہتی کو ایک غیر حقیقی اور موہوم چیز ٹھہرایا جائے۔ چنانچہ مسلمانان عالم کی دینی وحدت اور ملی یک جہتی کے خلاف رائے عامہ کو تیار کرنے کے لئے پان اسلامزم کی اصطلاح وضع کی گئی اور اس اصطلاح کے پردے میں وحدت اسلامی کو نشانہ بنایا گیا جس کا واضح مقصد خلافت اسلامیہ کو نشانہ بنانا تھا۔(محاضرات شریعت:صفحہ ۷)۔

ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی شریعت

اور اسلامی تعلیمات کو کس طرح نشانہ بنایا گیا اور اس کے بارے میں مغربی اہل قلم نے غلط فہمیاں پیدا کرنے میں کیا کردار ادا کیا۔

گزشتہ چند دہائیوں سے میڈیا میں اسلامی شریعت کی جن تعلیمات کو تنقید اور تضحیک کا ہدف بنایا جارہا ہے وہ خواتین سے متعلق ہیں۔ موجودہ دور میں میڈیا نے اسلام میں خواتین کے حقوق، طلاق ثلاثہ، تعدد ازدواج اور پردہ وغیرہ کے تعلق سے غلط فہمیاں پیدا کرنے کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع کر رکھا ہے، اور اس سلسلے میں جھوٹ اور مکر وفریب کی ساری حدوں کو پار کردیا ہے۔ اس پروپیگنڈے کی نشر واشاعت میں میڈیا کے شانہ بشانہ بہت سے فرقہ پرست افراد اور سیاسی جماعتیں بھی برابر کی شریک ہیں۔ اس بے بنیاد بات کو بڑے شدومد کے ساتھ بیان کیا جارہا ہے کہ اسلام نے خواتین کو مردوں کے برابر حقوق نہیں دیے، اسلام میں خواتین کے ساتھ ظلم روا رکھا گیا ہے، نیز شریعت میں خواتین کے متعلق جتنے بھی احکام بیان کئے گئے ہیں ان سب کا مقصد عورتوں کو گھر کی چار دیواری میں قید رکھ کر مردوں کے ماتحت رکھنا ہے وغیرہ، وغیرہ۔ اس کے لیے میڈیا نے سارا زور صرف کردیا ہے گویا دنیا میں بس یہی ایک مسئلہ رہ گیا ہے اور سارے لوگوں کو مسلم خواتین سے ہمدردی اور ان کے حقوق کے حصول کی فکر دامن گیر ہے۔

ماضی کے تجربات کو دیکھتے ہوئے یہ اندازہ لگانا مشکل نہیں کہ چونکہ موجودہ دور میں لوگوں کی ایک بڑی تعداد اسلام میں داخل ہورہی ہے، خاص طور سے خواتین کے حلقے میں اسلام کی طرف سب سے زیادہ رغبت پائی جاتی ہے۔ لہذا عالمی کفر اپنا سارا زور اس پر لگا رہا ہے کہ خواتین کے حلقے میں اسلام کو کس طرح بدنام کیا جائے اور اس کی تعلیمات کو مسخ کرکے پیش کیا جائے۔ لہذا یہ غلط فہمیاں پیدا کی جارہی ہیں تاکہ خواتین کے قبول اسلام پر بریک لگایا جاسکے۔

مذکورہ تفصیلات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اسلامی شریعت اور اس کی تعلیمات کے بارے میں معاشرے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کا ایک بڑا سبب میڈیا اور مغربی اہل قلم ہیں۔

شریعت سے ناواقفیت : غلط فہمی کی بنیادی وجہ : لیکن اس کا جو سب سے اہم اور بنیادی سبب ہے وہ کم علمی اور عدم واقفیت ہے، مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شریعت اسلامی کی اہمیت، اس کی تعلیمات اور اس کی حکمتوں اور مصلحتوں سے یکسر ناواقف ہے۔ بلکہ اسی کم علمی کی بناپر وہ میڈیا اور باطل افراد کے پھیلائے پروپیگنڈے کا آسانی سے شکار ہوجاتے ہیں۔

مسلمانوں میں ایک طبقہ تو وہ ہے جو جدید تعلیم یافتہ ہے، اول تو اس طبقہ میں اسلام، اسلامی تاریخ اور اسلامی تہذیب وتمدن سے واقف ہونے کا کوئی جذبہ ہی نہیں پایا جاتا، اور یہ اپنی فکری ساخت، تعلیمی پس منظر اور تہذیبی اٹھان کے اعتبار سے عام اہل مغرب سے مختلف نہیں ہوتا۔ اور اگر واقف ہونا بھی چاہتا ہے تو اس کا مطالعہ مغربی اہل قلم کی اسلامی موضوعات پر تصنیف کردہ کتابوں تک ہی محدود رہتا ہے۔ نتیجتاً اس طبقے میں شریعت اسلامی کے بارے میں مزید الجھنیں اور غلط فہمیاں جڑ پکڑنے لگتی ہیں۔

اسی طرح ایک بڑا طبقہ عوام الناس کا ہے جو شریعت سے جذباتی لگاؤ تو رکھتے ہیں لیکن اس کی تعلیمات سے یکسر ناواقف ہیں، یا سرسری اور ناقص معلومات رکھتے ہیں۔ شریعت کی تعلیمات کا ایک حصہ روزمرہ کے مسائل پر مشتمل ہے۔ جیسے طہارت کے مسائل، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور خرید وفروخت کے ضروری مسائل اور حلال وحرام کی بنیادی معلومات وغیرہ۔ یہ ایسے مسائل ہیں جن کا جاننا ہر مسلمان مرد وعورت کے لیے فرض عین ہے۔ لیکن افسوس کہ عوام الناس کی ایک بہت بڑی تعداد روزمرہ کے ان بنیادی اور ضروری مسائل سے بھی ناواقف ہے۔

شریعت کی تعلیمات سے ناواقفیت کی چند مثالیں: راقم الحروف کی ایک مرتبہ دو جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں سے ملاقات ہوئی، انہوں نے مجھ سے نماز سے متعلق چند مسائل دریافت کیے۔ گفتگو کے دوران غسل کے فرائض وغیرہ کی بات نکل گئی، میں نے ان کو غسل کے فرائض بتائے تو میری حیرت کی اس وقت انتہا نہ رہی جب انہوں نے کہا کہ مولانا صاحب! ہم پہلی دفعہ آج آپ سے یہ سن رہے ہیں کہ غسل کے تین فرائض ہیں اور فلاں

فلاں ہیں، پھر میں نے ان سے وضو کے فرائض معلوم کیے تو ایک نوجوان نے تو لاعلمی کا اظہار کیا، دوسرے نے بتایا کہ کلی کرنا، ناک میں پانی ڈالنا وغیرہ۔ حالانکہ ان کی عمریں تیس برس کے لگ بھگ تھی اور وہ جمعہ کے علاوہ دیگر نمازوں کا بھی اہتمام کرتے ہیں۔

اسی طرح ایک صاحب کا حال معلوم ہوا کہ ان کے پاس درود پاک کی ایک کتاب ہے جس کو مکمل پڑھنے میں چالیس منٹ لگتے ہونگے، اور ان صاحب کا اس کتاب کو تقریباً گزشتہ دس سال سے روزانہ بعد نماز فجر اور بعد نماز عشاء پابندی سے پڑھنے کا معمول ہے۔ جب انہوں نے مجھے وہ کتاب دکھائی تو پتہ چلا کہ وہ کتاب کسی من چلے کی مرتب کردہ ہے اور اس میں محض لغو اور شرکیہ عربی عبارتیں ہیں۔ جب ان صاحب کو میں نے کتاب کے مندرجات سے آگاہ کیا تو وہ صاحب سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

ایک شادی شدہ خاتون کے بارے میں معلوم ہوا کہ شادی کے کئی سالوں بعد تک اسے یہ نہیں پتا تھا کہ مرد سے ملاپ کے بعد غسل واجب ہوجاتا ہے، اس کا خیال تھا کہ دوسرے مرد سے اگر کوئی بدکاری کرے تو ہی غسل واجب ہوتا ہے، اپنے شوہر سے صحبت کرنے پر غسل ضروری نہیں۔ چنانچہ کئی سالوں تک اس نے بغیر غسل کیے ہی نمازیں ادا کیں۔ العیاذ باللہ۔

ان چند مثالوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ عوام الناس میں شریعت کی تعلیمات سے واقفیت کا کیا حال ہے؟ خاص طور سے مسلم خواتین کی صورت حال تو انتہائی ناگفتہ بہ ہے۔ اب اس کم علمی اور عدم واقفیت کا فائدہ میڈیا اور باطل افراد کو ہوجاتا ہے اور ان کے پھیلائے پروپیگنڈے سے مسلمان مرد وخواتین متاثر ہونے لگتے ہیں۔

معلوم ہوا کہ ہمارے اس دور میں مسلمانوں اور خاص طور سے خواتین میں شریعت کے بارے میں جو غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں اس کی بنیادی وجہ شریعت کی تعلیمات سے ان کی ناواقفیت ہے۔ لہٰذا ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت ہے کہ لوگوں کو شریعت کی تعلیمات سے آگاہ کیا جائے، شریعت کے اصل مفاہیم کو عام کیا جائے اور بتایا جائے کہ زندگی کے مختلف میدانوں سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ شریعت کے امتیازی خصائص اور اوصاف کیا ہیں؟ وغیرہ۔ خاص طور سے حلقۂ خواتین میں شریعت اسلامی کی مکمل معلومات فراہم کی جائے۔ راقم کا ذاتی تجربہ ہے کہ جب معقول انداز میں شریعت کی تعلیمات اور ان کی حکمتوں کو بیان کیا گیا تو ایک بڑی تعداد نے اس کو پسند کیا اور کسی حد تک غلط فہمیاں دور ہوئیں۔

علماء کرام کی ذمہ داری:

علماء کرام حضرات انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام کے وارث اور جانشین ہیں، اور یہ شرف اور فضیلت محض علم کی وجہ سے ہے، چونکہ علم اللہ رب العزت کی صفت اعلیٰ ہے، اسی لیے اللہ نے اپنے پیغمبروں کی نیابت اور جانشینی کی ذمہ داری بھی انہیں سونپی جو اس صفت علم میں دیگر مخلوقات میں ممتاز حیثیت پر فائز ہیں۔ ظاہر ہے جس قدر علماء کا مقام بلند ہے اسی مرتبہ کے لحاظ سے ان پر ذمہ داریوں کا بھی عظیم بوجھ ہے، چنانچہ حضرات علماء کرام کو معاشرے میں اپنی ذمہ داریاں نبھانے اور ایک مؤثر کردار ادا کرنے کے لیے حالات اور ماحول سے باخبر رہنا اشد ضروری ہے۔ ساتھ ہی انہیں چاہیے کہ وہ ہر لحہ بیدار مغزی اور غور وفکر سے کام لیں اور سوچیں کہ موجودہ حالات کا رخ کیا ہے اور اس کے تقاضے اور چیلنجز کیا ہیں، اور موجودہ دور کے پس منظر میں وہ کس طرح اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ان چیلنجز کا مقابلہ کرسکتے ہیں۔

جیسا کہ ذکر کردہ گزارشات سے معلوم ہوا کہ موجودہ حالات میں علماء کرام کی ایک اہم ذمہ داری یہ ہے کہ لوگوں کے سامنے شریعت اسلامی کا ایک جامع اور بھرپور تعارف پیش کیا جائے۔ شریعت کے بنیادی تصورات، احکام اور مقاصد کو وضاحت سے بیان کیا جائے اور لوگوں کے سامنے شریعت کو بالکل اسی طرح پیش کیا جائے جس طرح معتبر علماء کرام، فقہاء عظام اور متکلمین نے اس کو سمجھا اور پیش کیا۔ اسی طرح دور جدید کے عقلیت پرست اور مغرب زدہ ذہنوں کو مطمئن کرنے کے لیے اس بات کی وضاحت کا اہتمام بھی ضروری ہے کہ شریعت کی حکمت اور فلسفہ کیا ہے۔

شریعت اسلامی کے تعارف کے سلسلے میں اس بات کو پیش نظر رکھنا انتہائی ضروری ہے، وہ یہ کہ لوگوں کی علمی وفکری سطح مختلف ہوتی ہے اور ان کے سوچنے سمجھنے کے معیارات میں خاصا تنوع پایا جاتا ہے، لہٰذا شریعت اسلامی کے حوالے سے ان کی غلط فہمیوں اور اعتراضات کی نوعیت بھی مختلف ہوگی۔ یہی وجہ ہے کہ معاشرے کے ہر طبقہ تک اپنی بات پہونچانے کے لیے ایک ہی انداز اور اسلوب کا اختیار کرنا غیر حکیمانہ فعل ہے، اصل یہ ہے کہ موقع اور محل کے لحاظ سے اور مخاطب کی علمی وفکری سطح کو سامنے رکھتے ہوئے مختلف طریقۂ کار کا اختیار کیا جانا ضروری ہے۔

مسلمانوں میں ایک طبقہ وہ ہے جو متوسط درجہ کا پڑھا لکھا ہے یہ عوام الناس کا طبقہ ہے اور تعداد کے اعتبار سے یہ طبقہ سب سے بڑھا ہوا ہے۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسی ہے جن کا علماء سے ربط وتعلق ہے، جمعہ کے بیانات میں دینی مضامین بھی سنتے رہتے ہیں۔ ان میں کام کرنے کی نوعیت مختلف ہوگی۔ اس طبقے میں اپنی بات پہونچانے کا سب سے سہل طریقہ جمعہ کے بیانات ہیں، جمعہ کے بیانات کے ذریعے سے بہت سی باتیں ان کے گوش گزار کی جاسکتی ہیں۔

ایک دوسرا طبقہ وہ ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے۔ عموماً اس طبقہ کے افراد کا علماء سے کوئی خاص ربط وتعلق بھی نہیں ہوتا۔ لہٰذا اس طبقے میں یا تو سرے سے شریعت کا علم نہیں ہوتا یا انتہائی ناقص اور سرسری ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ طبقہ غلط فہمیوں کا جلد شکار ہوجاتا ہے۔ اس طبقے کے افراد تک شریعت کی معلومات پہونچانے کے لیے اسلامی موضوعات پر ماہانہ یا سہ ماہی پروگراموں کا انعقاد کیا جاسکتا ہے۔ یہاں اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ اس مجمع سے خطاب کرنے کے لیے ایسے عالم کا انتخاب کیا جائے جو متعلقہ مسئلہ پر کامل دسترس رکھتا ہو اور ساتھ ہی اسے انگریزی زبان سے شدبد ہو۔ نیز مخاطب کے مزاج ومذاق کو سمجھ کر مدلل اور معقول خطاب کرنے کی اہلیت رکھتا ہو۔

اسی طرح خواتین کے لیے بھی مستقل ماہانہ یا سہ ماہی نشست کا اہتمام کیا جاسکتا ہے۔ خواتین کا ایک بڑا طبقہ ایسا ہے جو اعلیٰ تعلیم یافتہ ہے اور ملازمت پیشہ ہے، ایسی خواتین کے لیے سہ ماہی پروگرام رکھے جاسکتے ہیں۔ ان پروگراموں میں خاص طور پر اسلام میں عورت کا مقام ومرتبہ اور خواتین کے متعلق شریعت کے احکام اور ان کی حکمتوں اور مصلحتوں پر سیر حاصل بحث ہو۔ خطاب کے بعد سوال وجواب کا بھی سیشن ہو، تاکہ شریعت اسلامی کے حوالے سے خواتین کے جو اعتراضات، خدشات یا غلط فہمیاں ہیں ان کا اطمنان بخش جواب دیا جاسکے۔

علماء کی ایک جماعت ایسی بھی ہونا ضروری ہے جو موقع بموقع اخباری نوٹ تیار کریں اور اس کا ہندی اور انگریزی ترجمہ کرواکر ہندی اور انگریزی کے مختلف اخبارات میں اس کو شائع کرائیں۔ اس کے علاوہ اردو، ہندی، انگریزی اور دیگر صوبائی زبانوں میں چھوٹے چھوٹے کتابچے تیار کئے جائیں، ان میں انتہائی معقول، مدلل، اچھوتے اور عام فہم اسلوب میں شریعت کی تعلیمات کو بیان کیا جائے۔

یہ چند تجاویز تھیں جو معزز علماء کرام کی خدمت میں پیش کی گئیں۔ انہیں اختیار کرکے مسلم معاشرے میں شریعت اسلامی کے تعارف اور اس کی تعلیمات کو عام کرنے کا کام کیا جاسکتا ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی حتمی اور آخری طریقہائے کار نہیں ہیں۔ ان کے علاوہ بھی موقع کی مناسبت سے مختلف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں۔ اصل کام معاشرے میں شریعت کی تعلیمات کو عام کرکے اس میں پھیلی غلط فہمیوں کو دور کرنا ہے۔ علماء کرام کو چاہیے کہ وہ زمانے کے مزاج اور رخ کو سمجھیں اور انتہائی غور وخوض سے کام لے کر مسلم معاشرے کو شریعت اسلامی سے واقف کرانے اور اس کی تعلیمات پر عمل درآمد کرانے کے لیے کوئی ایسا لائحہ عمل تلاش کریں جو انتہائی مؤثر، مستقل اور پائیدار ہو۔

☆☆☆

❑ ادبی شخصیات

امیر خسرو کی شاعرانہ عظمت

نایاب حسن
Email: nh912823@gmail.com

طوطئ ہند: ہندوستانی شاعری کی تاریخ میں امیر خسرو کا نام اس مہرِ نیم روز کی طرح ہے، جس کی ضیاپاشیوں سے یہاں کی بیش از سات سوسالہ ادبی وشعری تاریخ منور ہے، ایسے وقت میں جبکہ اردو زبان ابھی ظہور ونمود کے مرحلے میں تھی یہ اس کی خوش نصیبی کہیے کہ اسے خسرو جیسا عظیم وہمہ گیر صلاحیتوں سے لیس شاعر و نثر نگار ملا، جس نے ابتدا ہی میں اس کے دامن کو متنوع خوبیوں، رنگینیوں اور کمالات وخصائص سے مالامال کردیا۔ ہندوستان کی سماجی، مذہبی وقومی تاریخ میں امیر خسرو صرف اپنے پیرومرشد خواجہ نظام الدین اولیا سے بے پناہ محبت وشیفتگی کا استعارہ ہی نہیں؛ بلکہ علمی، ادبی وفنی حیثیت سے فارسی وہندوستانی شاعری کا امام اور اردو زبان و ادب کا معمارِ اولیں بھی ہے، اردو زبان جس لسانی، تہذیبی ومعاشرتی تنوع کی نمایندگی کرتی ہے، اس کی اساس دراصل امیر خسرو نے ہی رکھی تھی؛ چنانچہ ان کے یہاں اس کے مظاہر بھرپور توانائی، خوب صورتی اور دل کشی کے ساتھ نظر آتے ہیں، انھوں نے اپنی شاعری میں عربی، فارسی، پنجابی اور ہندی کے الفاظ کو اس خوبی سے برتا کہ وہ امر ہوگئے اور ہندوستان ہی نہیں، جہاں جہاں امیر خسرو کے اشعار پہنچے وہاں کے خاص وعام کے وردِ زبان ہوگئے، پھر شاعری میں امیر خسرو نے جونوبہ نو تجربات کیے، ان کی معنویت واہمیت بھی اپنی جگہ مسلم ہے، امیر کی شاعری میں زبان کی سلاست، معنیاتی گیرائی، فکری گہرائی، کنایات، تشبیہات، استعارات کی ایسی خوب صورت کائنات آباد ہے کہ صدیاں بیتنے کے بعد بھی اسے پڑھنے اور سننے والا سر دھنے بغیر نہیں رہتا، خسرو کو ہندوستان سے بے پناہ محبت ہے، سوان کے اشعار میں جابجا ہندوستانی تہذیب، ہندوستانی حسن، یہاں کے پھول، رنگ، موسم، کھانے، مذہبی تہوار، رسم و رواج اور سماجی سروکار کی مدح وستایش کا ایک خوب صورت سلسلہ نظر آتا ہے۔ امیر خسرو نے فارسی شاعری کو نئے افکار واسالیب سے لیس کرنے کے ساتھ شعری اَبعاد کو نئی وسعتوں اور ہمہ گیریوں سے ہم کنار کیا۔ نظم، غزل، قصیدہ، مثنوی، دوہے، گیت، قطعہ، رباعی وغیرہ شعری اصناف کے علاوہ نثر میں ''خزائن الفتوح'' اور ''رسائل الاعجاز'' امیر خسرو کے عظیم کارنامے ہیں۔ ہندوستانی موسیقی کو عربی وفارسی آہنگ سے مالامال کرکے اسے بین الاقوامی شناخت دلانے کا سہرا بھی بلاشرکتِ غیر طوطیِ ہند امیر خسرو کے سرجاتا ہے۔

پیدایش، تعلیم: امیر کا پورا نام ابوالحسن یمین الدین خسرو ہے اور امیر خسرو سے مشہور ہیں، ترکوں کے ایک قبیلے ''لاچین'' سے نسلی تعلق ہے، والد کا نام سیف الدین محمود ہے، ترکستان کے شہر ''کش'' کے رہنے والے اور اپنے قبیلے کے رئیس تھے، علامہ شبلی نعمانی نے فرشتہ و دولت شاہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ بلخ کے امرامیں سے تھے، بارہویں صدی عیسوی میں چنگیزی استبداد کا طوفان اٹھا، تو اپنے ملک سے ہجرت کرکے ہندستان آپہنچے، تب یہاں سلطان محمد تغلق کی حکومت تھی، اس نے ان کی قدردانی کی اور اعلیٰ سرکاری عہدے پر مامور کیا۔ یہاں ان کی شادی عمادالملک نامی شاہی امیر کی لڑکی سے

ہوئی، ان کا تعلق ’’پٹیالی‘‘ (ایٹہ، یوپی) سے تھا اوران کے زیر کمان دس ہزار سپاہیوں پر مشتمل فوج تھی۔ سیف الدین کو تین لڑکے ہوئے، جن میں امیر خسرو تیسرے تھے، امیر کی پیدایش 1253ء میں ’’پٹیالی‘‘ میں ہی ہوئی، ابھی صرف سات سال کے تھے کہ والد کا انتقال ہوگیا اور تعلیم وتربیت کی مکمل ذمے داری نانا نے نبھائی۔

شعور سنبھالتے ہی استاذ کی خدمت میں بٹھائے گئے، مگر کتاب پڑھنے سے زیادہ ان کی توجہ طبیعت کی فطری موزونی کی وجہ سے شعروشاعری پر رہتی تھی، البتہ تعلیم سے پوری طرح غافل بھی نہیں ہوتے تھے، جیسا کہ ان کی دستیاب شاعری سے ان کی علمیت کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے، پندرہ بیس سال کی عمر میں وہ مروجہ علوم کی تحصیل سے فارغ ہوگئے اور شعروشاعری میں تو اساتذۂ فن بھی ان کے روشن مستقبل کی پیش گوئیاں کرنے لگے تھے، اسی زمانے (1272ء) میں ان کا پہلا دیوان ’’تحفۃ الصغر‘‘ کے نام سے منظر عام پر آیا، اس میں امیر نے سولہ سے انیس سال کی عمر کے دوران کہے گئے کلام کو جمع کیا ہے، اس دیوان میں کل 35 قصائد، پانچ ترجیع بند اور ترکیب بند، متعدد قطعات اور ایک چھوٹی مثنوی ہے، شروع میں وہ سلطانی تخلص کرتے تھے، سواس میں اسی تخلص کو برتا ہے۔

درباری تعلقات: چوں کہ امیر خسرو کی پوری زندگی سرکاری درباروں سے وابستگی میں گزری ہے اوران کی شعری یا نثری تخلیقات کا راست یا بالواسطہ ان سے تعلق رہا ہے، متعدد امرا، صوبے دار اور شاہانِ دہلی کو تاج وتخت پر براجمان ہوتے اور پھر زوال پذیر ہوتے ہوئے اُنھوں نے دیکھا ہے، ان کی کئی ایک منظوم ومنثور تصانیف شاہی فتوحات وغیرہ ہی سے متعلق ہیں؛ اس لیے ان کی زندگی سے ان کے دور کے سیاسی احوال وانقلابات کو الگ نہیں کیا جا سکتا اور خسرو شناسی کے لیے لازمی ہے کہ خسرو کے دور میں ہندوستانی سیاست کے اتار چڑھاؤ کا بھی مطالعہ کیا جائے۔

جب خسرو تحصیلِ علم سے فارغ ہوئے اور ان کی شعری سرگرمیاں باقاعدہ شروع ہوئیں، اُس وقت دہلی میں غیاث الدین بلبن کی فرماں روائی تھی، اس کے درباری امرا میں ایک شخص کشلو خان (چھجو خان) تھا، جو بادشاہ کا بھتیجا اور اعلیٰ سرکاری عہدے پر فائز تھا، شعر شناسی کی بھی صلاحیت رکھتا تھا اور شعرا کو نوازتا بھی تھا، جس کی وجہ سے مصر، روم، عراق، خراسان وترکستان وغیرہ کے شعرا اس کی مجلس میں حاضری دیتے اور اعزازات سے نوازے جاتے تھے، امیر خسرو بھی پہلے پہل اسی کی مجلس میں پہنچے، اپنے دل کش آہنگ میں معنیٰ خیز اشعار سنائے اور کشلو خاں کے منظورِ نظر ہوگئے۔ ایک دن اس کی مجلس میں سلطان غیاث الدین بلبن کا بیٹا بغرا خاں بھی موجود تھا، دیگر بہت سے شعرا بھی حاضر تھے، شعروشاعری چلنے لگی، امیر نے بھی اپنا کلام سنایا، بغرا خاں متاثر ہوئے بغیر نہ رہا اور خوب نوازا، یہ منظر کشلو خاں کی آنکھ میں چبھ گیا، اس سے یہ دیکھا نہ گیا کہ اس کے دربار کا شاعر کسی دوسرے کے احسان اٹھا رہا ہے، بعد میں امیر نے بار ہا اس کی تلافی کرنی چاہی؛ لیکن کشلو خاں کی طبیعت کا تکدر ختم نہ ہوا، بالآخر امیر نے بغرا خاں سے وابستگی کا فیصلہ کیا، وہ تو منتظر ہی تھا، اس نے امیر پر نہ صرف نوازشات واکرامات کی بارش کی؛ بلکہ اپنا ندیمِ خاص بنالیا۔ اسی دوران لکھنوتی (بنگالہ) کے صوبے دار طغرل خاں نے بغاوت کردی، جس کا مقابلہ کرنے کے لیے بادشاہ آمادۂ سفر ہوا، اس سفر میں اس کا بیٹا بغرا خاں بھی تھا اوراس نے امیر خسرو کو بھی ساتھ رکھا، بغاوت پر قابو پانے کے بعد سلطان نے بنگال کی حکومت بغرا خاں کے سپرد کردی، جس کی وجہ سے امیر کو بھی وہیں قیام پذیر ہونا پڑا؛ لیکن دہلی کی کشش نے انھیں زیادہ دن بنگال میں رہنے نہیں دیا اور وہ جلد ہی دہلی واپس آگئے، واپس آنے کے بعد ان کی ملاقات بلبن کے بڑے بیٹے ملک محمد قاآن سے ہوئی، وہ نہایت ہی قابل، صاحبِ علم ونظر اور علم وفن کا قدر دان تھا، اس کی مجلس میں ہمیشہ شاہنامہ، دیوانِ خاقانی، انوری، خمسۂ نظامی کے اشعار پڑھے جاتے تھے۔ جب اس نے امیر خسرو کا شہرہ سنا، تو انھیں بلایا اور اپنے خاص شعرا میں شامل کرلیا، جب 1279ء میں ملتان کا حاکم مقرر ہوا، تو انھیں بھی اپنے ساتھ لیتا گیا، وہاں پانچ سال رہے، اسی دوران تیمور خاں نے بیس ہزار کی فوج کے ساتھ

لاہورودیبل پورکوتاراج کرتے ہوئے ملتان پرچڑھائی کردی، ملک محمد نے مردانہ وارمقابلہ کیااورتیمورکوشکست بھی ہوگئی،اس کے بعدوہ اپنے پانچ سوسپاہیوں کے ساتھ ایک تالاب کے کنارے میں نمازِظہرکی ادائیگی میں مشغول ہوگیا،اسی دوران 1283ء میں تاتاریوں نے پوری جماعت پرحملہ کردیااور ملک محمدقتل کردیاگیا،امیرخسروبھی اس معرکے میں شامل تھے،گرفتارکرکے بلخ لے جائے گئے،دوسال تک وہیں رہے،اس دوران اس سانحے سے متعلق انہوں نے نہایت ہی پردردمرثیے لکھےاوردہلی بھیجے،یہاں لوگ مہینوں تک ان مرثیوں کوسنتے،پڑھتے اوراپنے عزیزوں کی موت پرنوحہ کرتے رہے۔دوسال بعدکسی حیلے سےامیرخسرودہلی واپس آنے میں کامیاب ہوگئے،سلطان بلبن کے دربارمیں حاضری دی،اس کے بیٹے ملک محمدکے ناحق قتل پرایک بہت ہی پردردمرثیہ پڑھا،اسے سن کرپورے دربارمیں کہرام برپاہوگیا،کسی کوکسی کاہوش نہ رہا،سب دہاڑیں مارمارکررونے لگے، خودبادشاہ روتے روتے بےحال ہوگیا،کثرتِ گریہ کی وجہ سےاسے بخارآگیااوربالآخروہ اسی صدمے میں جاں بحق ہوگیا۔

اس کے بعدامیرکاتعلق خانِ جہاں سے قائم ہوا،یہ بھی امرائے شاہی میں سے تھا،جب وہ اودھ کاصوبہ دارمقررہوا،توامیرکوبھی اپنے ساتھ اودھ لے گیا، دوسال وہاں رہے،مگرپھراپنی والدہ کی محبت اوران کے بلاواپردہلی واپس آ گئے۔یہاں کے سیاسی حالات تیزی سے بدل رہے تھے،بلبن کی موت کے بعداس کے پوتے کیقبادخان کوحکمراں بنایاگیا،اس کی عمرصرف سترہ سال تھی اوروہ اس میدان کاآدمی بھی نہ تھا،شراب وکباب اورعیاشی میں ڈوبارہتا، مفادپرست امرائےسلطنت فائدہ اٹھاتے رہے،سیاسی ناپختہ کاری کی وجہ سےاس نے خوداپنے باپ بغراخاں سے مقابلےکی ٹھان لی ،جواس وقت بنگال کاحکمراں تھااوردہلی سےفوج لے کرنکل بھی گیا،راستے میں دونوں طرف سے نامہ وپیام ہوتے رہے، بالآخر باپ بیٹے میں صلح ہوگئی،کیقبادنے امیرسے درخواست کی کہ اس واقعے کومنظوم کردیں؛چنانچہ چھ ماہ کی محنت کے بعدامیرنے مثنوی ''قران السعدین''لکھی،یہ ان کی پہلی مثنوی ہے،اس میں اشعارکی تعدادتقریباً 3944 ہے۔کیقبادصرف تین سال حکومت کرسکا،بیماری میں مبتلاہوکرمرگیا،اس کے بعداس کابیٹاشمس الدین کیکاؤس تخت نشیں ہوا،وہ بالکل بچہ تھا،صرف تین ماہ بعدامرائے سلطنت نے اسے قیدکردیااوراس کے بعدجب بلبن کے خانوادے سےکوئی وارث نہ بچا،توترکی فوجی جلال الدین خلجی،جس کا پہلے سے دربارمیں اثرورسوخ تھا،تختِ سلطنت پربراجمان ہوگیا،یہ شخص علمی اعتبار سےبھی باصلاحیت تھا،ادب شناس وادب نوازاورشعروسخن سے بھی دلچسپی رکھتاتھا،اس نے امیرخسروکواپنے دربارِخاص میں شامل کرلیا،امیرنے اس کی فتوحات کو''تاج الفتوح''کے نام سے نظم کیا،یہ امیرخسروکی دوسری تاریخی مثنوی ہے،جو1291ء میں پایۂ تکمیل کوپہنچی،اس میں جلال الدین خلجی کی 4 فتوحات کاذکرہے، جواسے ایک سال کے عرصے میں حاصل ہوئیں، اس کے بعدتختِ حکومت پراس کا بھتیجاعلاء الدین خلجی قابض ہوگیا،یہ شخص بھی متعددسیاسی وانتظامی خوبیوں کے ساتھ علم و ادب نوازتھا،اس نے بھی امیرخسروکاخصوصی اعزازواکرام کیا،امیرنے اس کی فتوحات کےتفصیلی تذکرے پرمشتمل''تاریخِ علائی''یا''خزائن الفتوح''لکھی،یہ علاؤالدین خلجی کےعہدکی مختصرسی تاریخ ہے،اس میں 1295ء سے 1311ء تک کےحالات درج ہیں،اسی زمانے میں انہوں نے خمسۂ نظامی کے جواب میں پانچ مثنویاں لکھیں۔یہ سب مثنویاں علاؤالدین خلجی کےنام منسوب ہیں:

(1) مطلع الانوار: امیرخسروکی اس تصنیف کاموضوع پندو نصیحت اوراخلاق وتصوف ہے، یہ نظامی گنجوی کی مثنوی''مخزن الاسرار''کے جواب میں ہے اوردوہفتے میں مکمل ہوئی، اس کا سالِ تالیف 1298ء ہے۔

(2) شیریں خسرو:نظامی کی مثنوی''خسروشیریں''کاجواب ہے،اشعارکی تعداد4134ہےاور1298ءمیں مکمل ہوئی۔

(3) لیلیٰ ومجنوں:نظامی کی مثنوی لیلیٰ ومجنوں کاجواب ہےاور 1299ءمیں لکھی گئی،یہ2650اشعارپرمشتمل ہے۔

(4) آئینۂ سکندری: نظامی کی مثنوی ''سکندر نامہ'' کے جواب میں 1299ء میں لکھی گئی ہے۔

(5) ہشت بہشت: نظامی کی مثنوی 'ہفت پیکر'' کا جواب ہے، اس میں اشعار کی تعداد 3350 ہے اور یہ 1301ء میں لکھی گئی ہے۔

مولانا جامی نے ''بہارستان'' میں امیر خسرو کے خمسہ کو خمسۂ نظامی کے جواب میں لکھی گئی تمام مثنویوں میں بہتر قرار دیا ہے۔

خلجی حکومت کے خاتمے کے بعد جب غازی ملک (غیاث الدین تغلق) دہلی میں تخت نشیں ہوا، تو اس نے بھی خسرو شناسی کا بھرپور ثبوت دیتے ہوئے امیر کو خوب نوازا اور حسبِ مرتبہ ان کا اکرام کیا، امیر نے بھی احسان شناسی کا ثبوت دیا اور ''تغلق نامہ'' لکھا، جس میں اس کی تخت نشینی، فوج کشی اور حصول یابیوں کا ذکر ہے۔

دیگر تصانیف: مولانا جامی نے امیر خسرو کی مکمل تصنیفات کی تعداد 99 بتائی ہیں، ممکن ہے کہ امیر خسرو نے اس قدر کتابیں تصنیف کی ہوں؛ کیونکہ آپ بہت پر گو شاعر تھے اور زندگی کے آخری لمحے تک شعر کہتے رہے محتاط اندازے کے مطابق انہوں نے فارسی زبان میں پانچ لاکھ اشعار کہے، جبکہ ہندوی اور پنجابی وغیرہ کے اشعار بھی اتنے ہی ہوں گے؛ لیکن ان کی کتابوں اور شعری دواوین میں سے صرف بیس بائیس دستیاب ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں، جن کا اس مقالے میں مختلف حوالوں سے ذکر ہوا، ان کے علاوہ ''وسط الحیات''، ''غرۃ الکمال''، ''بقیہ نقیہ''، ''نہایۃ الکمال''، ''عشقیہ''، ''نہ سپہر''، ''قصۂ چہار درویش''، ''جواہرِ خسروی'' اور ان کے پیر و مرشد حضرت نظام الدین اولیاء کے ملفوظات پر مشتمل ''افضل الفوائد'' بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

وفات: غیاث الدین تغلق نے جب بنگال کا سفر کیا، تو خسرو کو بھی ساتھ لے گیا، ابھی وہیں تھے کہ اپنے مرشد خواجہ نظام الدین اولیا کی وفات کی خبر سنی، سنتے ہی بھاگم بھاگ دہلی آئے، غم کے مارے برا حال ہو گیا، جو کچھ مال و دولت تھا، سب لٹا دیا اور بس اپنے محبوب کی یاد میں خود کو گھلانے لگے، یہاں تک کہ چھ ماہ بعد اکتوبر 1325ء میں انہوں نے بھی وفات پائی اور اپنے مرشد کے پاس ہی مدفون ہوئے۔ (مستفاد از شعر العجم، علامہ شبلی نعمانی، ج: دوم، ص: 123-107، ط: معارف پریس اعظم گڑھ، طبع سوم)۔

شاعرانہ فضل و کمال: امیر خسرو نے ہر رنگ و آہنگ میں شعر کہا ہے اور تمام اصنافِ سخن کو اپنے نتائج فکر سے مالا مال کیا ہے، فارسی شاعری کی تاریخ میں دوسری ایسی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی، جس نے ہر صنف میں اس خوب صورتی، پختگی اور مہارت سے شعر کہے ہوں، جو خسرو کے ہاں نمایاں طور پر نظر آتی ہیں، یہ واقعہ ہے کہ خسرو کے اشعار ہر صنفِ سخن کے استادوں کے ہم پلہ ہیں، فارسی کے نامور شعرا میں فردوسی کی شناخت مثنوی سے ہے، سعدی قصیدہ گوئی کے میدان میں لاچار نظر آتے ہیں، انوری قصیدے کا بادشاہ ہے؛ لیکن وہ غزل، مثنوی اور دوسری اصنافِ سخن میں طبع آزمائی نہیں کر سکتا، حافظ اور نظیری غزل کے دائرے سے باہر نہیں نکل پائے؛ لیکن خسرو کا شاعرانہ کمال، ہمہ گیری اور فنکارانہ نابغیت غزل، مثنوی، قصیدہ اور رباعی سب پر محیط ہے؛ یہی وجہ ہے کہ تب سے اب تک فارسی شاعری میں ان کی دھاک جمی ہوئی ہے اور بڑے بڑے اساتذۂ فن نے ان کی برتری کو تسلیم کیا ہے۔ یہ بھی خسرو کی انفرادیت کہی جائے گی کہ ''غرۃ الکمال'' کے دیباچے میں انہوں نے نہایت انصاف اور دیانت داری کے ساتھ خود اپنا محاکمہ کیا ہے، وہ لکھتے ہیں کہ شاعری کے معاملے میں وہ شخص حقیقی استاد ہے، جس کے کلام میں یہ چار شرائط موجود ہوں:

1۔ صاحبِ طرزِ خاص ہو۔
2۔ اس کا کلام غلطیوں سے پاک ہو۔
3۔ انداز شاعرانہ ہو، واعظانہ و صوفیانہ نہ ہو۔
4۔ مرقع دوزی نہ ہو، یعنی دوسروں کا کلام سرقہ کر کے اپنی شاعرانہ عظمت کا محل نہ تعمیر کرے۔

ان شرائط کے ساتھ ساتھ اپنے بارے میں وہ بتاتے ہیں کہ جو کچھ میں نے نصیحت کے طور پر اخلاقیات کے باب میں لکھا ہے، اس میں حکیم ثنائی اور خاقانی کی پیروی کی ہے، وہ کھلے دل سے کہتے ہیں کہ ان چار شرائط میں سے مجھ میں صرف دو شرطیں پائی جاتی ہیں؛ اس لیے میں درحقیقت استاد نہیں ہوں، میرا کلام صوفیا اور واعظین

جیسا نہیں ہے، دوسرا یہ کہ میں چوری نہیں کرتا، انصاف اور خود شناسی کی اس سے بہتر مثال بطور خاص شاعری میں شاید ہی کسی نے پیش کی ہو۔ انہوں نے غزل میں سعدی، مثنوی میں نظامی گنجوی، اخلاقی شاعری میں ثنائی وخاقانی، قصیدے میں رضی الدین نیشاپوری، عرفی ونظیری کو نمونہ بنایا ہے۔ خسرو سے پہلے مخصوص اشیا مثلاً: قلم، کاغذ، دریا، کشتی، شمع، صراحی، پھلوں اور پھولوں کے بارے میں ایسی مسلسل نظمیں نہیں کہی گئیں کہ ان کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے، یہ ایشیائی شاعری کا نقص شمار کیا جاتا تھا، امیر خسرو نے اس کمی کو پورا کیا؛ چنانچہ مثنوی ''قران السعدین'' میں اکثر اسی قسم کی مثنوی لکھی ہے اور اس میں ہندوستانی آب وہواسمیت یہاں کے پھل، پھول، کھانے، تہوار، رسموں؛ سب کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔ اس قسم کی شاعری کو خسرو وصف نگاری کہتے ہیں (شعر العجم، ج: دوم)۔

قصیدہ نگاری: امیر خسرو نے قصائد میں خاقانی، انوری اور کمال کی پیروی کی ہے، جس استاد شاعر کے جواب میں قصیدہ کہتے ہیں، اس کی پیروی کرتے ہیں۔ خاقانی کے ایک مشہور قصیدے کے جواب میں خسرو نے ایک طویل قصیدہ لکھا ہے، جس میں اسلوب، طرزِ تحریر، تشبیہات وکنایات اور ترکیبات بھی انہی کے جیسی استعمال کی ہیں۔

غزلیاتِ خسرو: غزل گوئی میں امیر خسرو کے پیش رو سعدی شیرازی ہیں، آپ کی شاعری کا شباب عین اس وقت شروع ہوا، جب سعدی اپنے دورِ شباب سے گزر چکے تھے، سعدی نے شیراز میں بیٹھ کر جو نغمہ سرائی کی، اس سے ہند کے اربابِ ذوق نے خوب لطف بھی اٹھایا اور بقدرِ ظرف استفادہ بھی کیا؛ چنانچہ خسرو نے بھی غزل گوئی میں شیخ سعدی کی پیروی کی؛ اس وجہ سے انھیں طوطیِ ہند بھی کہا گیا۔ البتہ انھوں نے غزل میں تقلیدِ محض نہیں کی؛ بلکہ بہت سی نئی باتیں، حسن وکشش کے نئے مظاہر، دل کشی وجاذبیت کے مختلف پہلو بھی تلاش کیے۔ بقول علامہ شبلی نعمانی خسرو کی غزلیات، معاملاتِ عشق کے بیان، اسلوب کی جدت، عجز ونیاز، زبان کی نرمی اور شیرینی، خیالات کی سادگی، بحروں کے ترنم کی وجہ سے نہایت دل پسند ومقبول ہیں۔

سوز و گداز: سعدی نے غزل کو اس کے مزاج کے مطابق لہجہ بخشا اور اس کے دامن کو وسیع تر کیا، اس لیے انھیں فارسی غزل کا مقتدا اور امام مانا جاتا ہے، امیر خسرو نے اپنی غزلوں میں ان کی پیروی کی اور ساتھ ہی اپنی فکری زرخیزی کی بہ دولت فارسی غزل میں نئی خصوصیات بھی سموئیں، شدتِ جذبات واحساسات، حسن وعشق کے معاملات، قلبی واردات، محبوب کی بے نیازی وناز آفرینی، عاشق کی نیازمندی وخاکساری، فراق کی اذیتیں اور جوش وحرارت ان کی غزلوں میں یہ تمام وکمال موجود ہیں، بقول شبلی نعمانی: ''سوز وگداز کے خیالات جب وہ ادا کرتے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ آگ سے دھواں اٹھ رہا ہے''۔ (شعر العجم، ج: دوم، ص: 170)۔ مثال کے طور ایک شعر ملاحظہ ہو:

می روی وگریہ می آید مرا
ساعتے بنشیں کہ باراں گزرد

محبوب کی بے رخی اور چھوڑ کر چلے جانے پر عاشق کی آنکھوں سے آنسوؤں کا بہنا معمول کا واقعہ ہے؛ لیکن اس کے بیان کا جو انداز خسرو نے اختیار کیا، اس نے اس شعر میں ایک خاص قسم کی جاذبیت، اثر انگیزی اور معنویت پیدا کردی ہے۔ تمھارے جانے کی وجہ سے میری آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، کچھ دیر رک جاؤ کہ بارش تھم جائے۔

جدتِ اسلوب: جدتِ اسلوب غزل کے حسن وجمال اور اس کی جامعیت وکمال کا اہم ترین وسیلہ ہے۔ فارسی شاعری میں شیخ سعدی اس کے موجد کہے جاتے ہیں؛ لیکن امیر خسرو نے اس میں جو نئے نئے رنگ بھرے، ان کا پہلے کی شاعری میں تصور بھی نہیں تھا، مثلاً محبوب کی گراں قدری کو بیان کرنے کے لیے یہ اسلوب کس کے ذہن میں آیا ہوگا؟

ہردو عالم قیمتِ خود گفتہ اِی
نرخ بالا کن کہ ارزانی ہنوز

شاعر محبوب سے مخاطب ہے کہ تم نے دونوں جہانوں کو اپنی قیمت قرار دیا ہے؛ لیکن تمھارے حسن وکشش، دل فریبی ودل ربائی

کے سامنے تو یہ قیمت بھی کم ہے؛اس لیے اپنی قیمت میں اضافہ کرو۔ معشوق ظلم و ستم، بے رخی و بے وفائی کرنے کے باوجود محبوب ہے،اس مضمون کو بیان کرنے کا یہ انوکھا انداز:

جاں زتن بردی ودرجانی ہنوز
دردہا دادی ودرمانی ہنوز

محبوب کے سامنے خودسپردگی کے لطیف وکیف آگیں احساسات کو بیان کرنے کا یہ خوب صورت اسلوب بھی خسرو کا امتیاز ہے:

خسرو بہ کمندِ تو اسیر است
بیچارہ کجا رود زکویت

خسرو تو تمھارے کمندِ محبت کا قیدی ہے، بے چارہ تیری گلی سے نکل کر کہاں جائے۔اس شعر میں جو عاشق کا عجز و نیاز، طرزِ اظہار کا بے ساختہ پن اور خلوص کا وفور ہے وہ صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔

تشبیہات: امیر خسرو کی غزلوں میں تشبیہات کی بہتات ہے اور سبھی تشبیہات طبع زاد ہیں،ان کی شاید ہی کوئی غزل ایسی ہو،جس میں یہ وصف نہ پایا جاتا ہو، پھر چوں کہ خسرو ہندوستان کے پروردہ ہیں؛اس لیے انہیں ہندی ماحول سے تشبیہات کے کچھ ایسے مظاہر بھی مل جاتے ہیں،جو عموماً فارسی شاعری میں نہیں نظر آتے،مثلاً فارسی شاعری میں عام طور پر محبوب کی رفتار کو مور کے خرام سے تشبیہ دی جاتی ہے؛لیکن خسرو کو کبوتر کی مستانہ چال میں بھی وہی کیف و مستی نظر آتی ہے:

خرامِ آں صنم ناز نیں بعیارے
کبوترے بخرام آمدہ است پندارے

منظر کشی: منظر کشی بھی غزل کا ایک اہم وصف ہے اور اس میں شاعر کی قوتِ ادراک و تخیل کا اہم کردار ہوتا ہے،شاعر جتنا زیادہ فطرت کی دل فریبیوں سے آگاہ ہوگا، مناظرِ فطرت کا جمال جس قدر اس پر آشکار ہوگا،اس کی منظر کشی اتنی ہی بامعنی اور خوب صورت ہوگی۔امیر خسرو اس میں بھی صاحبِ کمال ہیں اور انہوں نے اپنی غزلوں میں جو منظر کشی کی ہے،بلاشبہ ان میں ظاہری و معنوی حسن وخوب صورتی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے،مثلاً یہ شعر:

بادِصبا چو از رخِ اوزلف درربود
ابرِ سیہ کشادہ شد و آفتاب کرد

بادصبا کے جھونکے نے جب محبوب کے چہرے سے زلف کو ہٹا دیا تو ایسا لگا کہ گویا بادل چھٹنے کے بعد سورج نکل آیا ہو۔اس شعر میں محبوب کی زلف کو بادل اور اس کے چہرے کو آفتاب سے تشبیہ دی ہے اور ساتھ ہی چہرے سے زلف کے ہٹنے کے منظر کو اس خوبی سے بیان کیا ہے کہ قاری عش عش کیے بنا نہیں رہتا۔

معاملہ بندی: معاملاتِ عشق کے بیان کو بقول مولانا شبلی نعمانی اہلِ لکھنؤ معاملہ بندی کہتے ہیں اور مولانا آزاد نے امیر خسرو کو معاملہ بندی کا موجد قرار دیا ہے:

خوش آں زمانے کہ بہ رویش نظرِ خفتہ کنم
چو سوئے من نگرد او نظر بگردانم

وہ وقت بہت ہی لطف انگیز ہوتا ہے، جب میں اسے دزدیدہ نظروں سے دیکھتا ہوں؛لیکن جب وہ میری طرف دیکھتا ہے،تو میں نظریں جھکا لیتا ہوں۔

موسیقی: موسیقی میں تو امیر خسرو امامِ وقت تھے،سوانھوں نے جہاں اپنی شاعری میں الفاظ واسلوب کی خوب صورتی پر توجہ مرکوز کی ہے، وہیں موسیقیت اور ترنم پر بھی زور دیا ہے،ان کے زیادہ تر اشعار میں غنائیت کا ایک خاص عنصر پایا جاتا ہے،جس سے سامع یا قاری کے وجدان پر کیف و سرمستی طاری ہو جاتی ہے اور وہ جھومنے لگتا ہے،ان کے اشعار زیادہ تر چھوٹی بحروں میں ہیں اور اس کے ذریعے انھوں نے ان اشعار میں روانی، سلاست اور ترنم ریزی پیدا کرنے کی شعوری کوشش کی ہے۔

مضمون آفرینی: مضمون آفرینی سبکِ ہندی کی خصوصیت ہے اور فارسی شاعری میں یہ کمال اسمٰعیل کی ایجاد ہے؛ لیکن ان کی مضمون آفرینی قصائد تک محدود ہے،غزل میں مضمون آفرینی کے موجد امیر خسرو ہیں،مثلاً ان کا ایک شعر ہے:

زہے عمرِ درازِ عاشقاں گر
شبِ ہجراں حسابِ عمر گیرند

اگر عاشقوں کی عمر میں ہجر وفراق کی رات کو بھی شامل کرلیا جائے تو ان کی عمر بہت ہی دراز ہوجائے گی۔مرزا غالب نے اسی مضمون کو یوں بیان کیا ہے:

کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
شب ہائے ہجر کو بھی رکھوں گر حساب میں

بیان کا تسلسل: غزل کا یہ عیب شمار کیا جاتا ہے کہ اس کے مضامین میں تسلسل نہیں ہوتا،نہ قدما کی شاعری میں تسلسل نظر آتا ہے اور نہ متاخرین کی غزلوں میں ایسا ہوا،قصیدے مدح کے لیے مخصوص ہیں،مثنوی اخلاقیات یا قصے کہانیوں کے لیے ہیں اور ان میں موضوع ومضمون کے لحاظ سے تسلسل ہوتا ہے؛لیکن اگر غزل میں معاملاتِ حسن وعشق کو تفصیل سے بیان کرنا ہو،تو اس صورت میں مضامین ومعانی کے تسلسل کی داغ بیل امیر خسرو نے ڈالی،کسی مخصوص کیفیت کے سحر میں ڈوب کر پوری غزل لکھ جاتے ہیں۔ (شعر العجم،ج:دوم)۔

اس کے علاوہ تصوف کے نکتے،صنائع وبدائع،روزمرہ اور عام بول چال کی زبان کا بخوبی استعمال بھی امیر خسرو کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں،سادی زبان اور سہل اسلوب میں اخلاقیات کی تلقین وتعلیم پر بھی انھوں نے ہزاروں اشعار میں زور دیا ہے،عربی وپنجابی،سنسکرت زبانوں سے بھی انہیں بھرپور واقفیت تھی، سوانہوں نے جابجا ان زبانوں کے الفاظ بھی بخوبی استعمال کیے ہیں اور جوان کے لاکھوں ہندوی یا ہندوستانی زبان کے اشعار ہیں،وہ اگرچہ محفوظ نہیں کیے جاسکے،مگر جو کچھ بھی سینہ بسینہ محفوظ رہ گئے،وہ ہندوستانی شاعری کو نئے آفاق تک پہنچانے کے ساتھ اردو زبان وشاعری کی بنیاد واساس بن گئے۔ایک شعر میں دو الگ الگ زبانوں کا استعمال بھی امیر خسرو کے یہاں بہت ہی بھلا اور خوب صورت معلوم ہوتا ہے،اس حوالے سے ان کی ایک معروف غزل کے چند اشعار:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دُرائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں ندارم اے جاں،نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں

(اس غریب کے حال سے تغافل مت برت،باتیں بنا کر آنکھیں نہ پھیر،میری جان اب جدائی کی تاب نہیں،مجھے اپنے سینے سے کیوں نہیں لگا لیتے)۔

شبانِ ہجراں دراز چوں زلف وروزِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

(جدائی کی راتیں زلف کی مانند دراز اور وصال کے دن عمر کی مانند مختصر ہیں،اے دوست محبوب کو دیکھے بِنا یہ اندھیری راتیں کیوں کر کاٹوں؟)

یکا یک از دل دو چشم جادو بصد فریبم بہ برد تسکیں
کسے پڑی ہے،جو جا سنائے پیارے پی کو ہماری بتیاں

(پلک جھپکنے میں وہ دو جادو بھری آنکھیں میرے دل کا سکون لے اُڑیں،اب کسے پڑی ہے کہ جا کر محبوب کو ہمارے دل کا حال سنائے)

چوں شمعِ سوزاں،چوں ذرہ حیراں ہمیشہ گریاں بہ عشق آں ام
نہ نیند نیناں،نہ اَنگ چیناں،نہ آپ آویں،نہ بھیجیں پتیاں

(میں عشق میں جلتی ہوئی شمع اور ذرۂ حیراں کی طرح مسلسل گریہ کناں ہوں،نہ آنکھوں میں نیند،نہ تن کو چین؛کیوں کہ نہ تو وہ خود آتے ہیں اور نہ کوئی پیغام بھیجتے ہیں)۔

اعتراف کمال: خسرو کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف ان کے معاصر عظیم شعرانے کیا ہے،مؤرخین وادبا نے انھیں خراجِ تحسین پیش کیا ہے،متاخرین نے ان کے شعری سرمایے سے استفادہ واستفاضہ کے ذریعے اپنی شاعری کے چراغ روشن کیے ہیں،اردو شاعری اور اردو زبان کو ان سے فکر ونظر کی بنیادیں حاصل ہوئیں،یہی اسباب ہیں کہ آج کم وبیش ساڑھے سات سو سال کا طویل ترین عرصہ گزر جانے کے باوجود ہندوستانی وفارسی شعری وادبی دنیا ان کی بارگاہِ عظمت کے سامنے تعظیماً جھکی ہوئی ہے۔

فارسی شاعری میں حافظ شیرازی کا مقام ومرتبہ خود بہت بلند ہے،مگر وہ بھی خسرو کے عقیدت کیش ہیں،اسی عقیدت کے زیر اثر انھوں نے خسرو کی منتخب غزلیات کا ایک قلمی نسخہ بھی تیار کیا تھا۔ اس کے علاوہ حافظ نے غیاث الدین حاکم بنگال کو جو غزل بھیجی تھی،

اس کے ایک شعر میں امیر خسرو کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

شکر شکن شوند ہمہ طوطیانِ ہند
این قدر پارسی کہ بہ بنگالہ می رود

عرفی لکھتا ہے:

بروحِ خسرو ازیں پارسی شکر دارم
کہ کامِ طوطی ہندوستاں شود شیریں

''جواہر الاسرار'' کے مصنف نے لکھا ہے کہ شیخ سعدی خسرو سے ملاقات کے لیے دہلی تشریف لائے تھے، علامہ شبلی نعمانی تاریخی حقائق کی وجہ سے اس واقعے کی تردید کرتے ہیں، البتہ یہ بالکل درست واقعہ ہے کہ جب ہندوستان کے بادشاہ نے شیخ سعدی کو بلا بھیجا، تو انھوں نے بڑھاپے کی وجہ سے آنے سے معذرت کردی اور ساتھ ہی یہ کہا کہ: ''خسرو جوہر قابل ہیں، ان کی تربیت کی جائے''۔ اس وقت خسرو کی عمر محض تیس بتیس برس تھی۔ (شعر العجم، ج: دوم، ص: 143) ان کے علاوہ امیر حسن علا سجزی، جو خسرو کے معاصر اور اساتذۂ غزل میں سے تھے، اپنے کلام کا خسرو سے موازنہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

خسرو ازراہِ کرم بہ پذیرد
آنچہ من بندہ حسن می گویم
سخنم چوں سخنِ خسرو نیست
سخن ایں است کہ من می گویم

ملا عصمت بخاری و باباخجندی بھی خسرو کے مداح ہیں، کاتبی نیشاپوری کہتے ہیں:

میر خسرو را علیہ الرحمہ شب دیدم بخواب
گفتم ایں عصمت ترا ایک خوشہ چینِ خرمن است
شعرِ او چوں شعرِ تو اندر جہاں شہرت گرفت
گفت باکے نیست شعرِ او ہماں شعرِ من است

مولانا جامی نے ''بہارستان'' میں ان کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، مؤرخین میں ضیاء الدین برنی جوان کے معاصر تھے، انھوں نے ''تاریخِ فیروز شاہی'' میں بڑے وقیع الفاظ میں امیر خسرو کا ذکر کیا ہے، صوفیا کے طبقے میں داراشکوہ نے ''سفینۃ الاولیا'' میں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے محدث کی حیثیت سے اپنی ایک تحریر میں امیر خسرو کا ذکر کرتے ہوئے انھیں سلطان الشعرا، برہان الفضلا، یگانۂ عالم دروادیِ سخن کے خطابات سے یاد کیا ہے، تذکرہ نویسوں میں فرشتہ، دولت شاہ سمرقندی، آزاد بلگرامی نے خسرو کے فضل و کمال پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ (خسرو شناسی، مرتبہ: ظ انصاری، ابوالفیض سحر، ص: 192، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان، نئی دہلی 1998ء)۔

علامہ شبلی نعمانی ''شعر العجم'' میں لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں چھ سو برس سے آج تک اس درجہ کا جامعِ کمالات نہیں پیدا ہوا اور سچ پوچھو تو اس قدر مختلف اور گونا گوں اوصاف کے جامع ایران و روم کی خاک نے بھی ہزاروں برس کی مدت میں دو چار ہی پیدا کیے ہوں گے، صرف ایک شاعری کو لو، تو ان کی جامعیت پر حیرت ہوتی ہے! فردوسی، سعدی، انوری، حافظ، عرفی، نظیری بے شبہ اقلیمِ سخن کے جم و کے ہیں، مگر ان کی حدودِ حکومت ایک اقلیم سے آگے نہیں بڑھتیں، حافظ، عرفی، نظیری غزل کے دائرہ سے باہر نہیں نکل سکتے اور انوری غزل کو چھو نہیں سکتا؛ لیکن خسرو کی جہانگیری میں غزل، مثنوی، قصیدہ، رباعی سب کچھ داخل ہے اور چھوٹے چھوٹے خطہ ہائے سخن یعنی تضمین، مستزاد اور صنائع و بدائع کا تو شمار نہیں...... مختلف زبانوں کی زبان دانی کا یہ حال ہے کہ ترکی اور فارسی اصلی زبان ہے، عربی میں ادبائے عرب کے ہمسر ہیں اور سنسکرت کے ماہر ہیں''۔ (ج: دوم، ص: 34-132، متفرقاً)۔ اور بیسویں صدی میں اردو و فارسی شاعری کی توانا ترین آواز علامہ اقبال نے خسرو کے نقشِ دوام کا ذکر یوں کیا ہے:

رہے نہ ایبک و غوری کے معرکے باقی
ہمیشہ تازہ و شیریں ہے نغمۂ خسرو

☆☆☆

زبان و تہذیب

ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں

مفتی محمد تقی عثمانی

ہماری روزمرہ کی بول چال میں انگریزی الفاظ، بلکہ پورے جملوں کا استعمال جس تیز رفتاری سے بڑھ رہا ہے، وہ ایک ایسا لمحۂ فکریہ بن چکا ہے کہ اگر اس پر ابھی سے توجہ نہ دی گئی تو ہماری زبان، اور اس کے پس منظر میں ہماری ثقافت اور ہمارے دینی، علمی اور ادبی سرمائے کا نہ جانے کیا حشر بنے گا؟ میں جب اپنے بھائیوں کو عام گفتگو میں انگریزی الفاظ کا بے محابا استعمال کرتے اور اپنی زبان کو اردو انگریزی کا ایک مضحکہ خیز ملغوبہ بناتے دیکھتا ہوں تو واقعۃً یہ تشویش لاحق ہوتی ہے کہ ہم اپنی زبان کو تباہی کے کس غار کی طرف لے جا رہے ہیں؟

ابھی کچھ عرصہ پہلے کی بات ہے، اسلام آباد کے ایک سفر کے دوران جہاز میں میری سیٹ کے قریب دو اعلیٰ سرکاری افسر سفر کر رہے تھے، ان میں سے ایک صاحب پہلے سے سیٹ پر بیٹھے تھے، دوسرے صاحب ان کے برابر کی سیٹ کا بورڈنگ کارڈ لئے ہوئے قریب آئے، اور پہلے صاحب کو اپنی سیٹ کے برابر میں بیٹھا دیکھا تو بہت خوش ہوئے، اور ان کے پاس بیٹھتے ہوئے ان سے گفتگو شروع کر دی۔ دونوں کے درمیان جو بات چیت ہوئی وہ کچھ اس قسم کی تھی:

''اوہو، مسٹر......السلام علیکم، وہاٹ اے پلیزنٹ سرپرائز! کیا حال چال ہیں؟ ہاؤ آر یو''

''فائن تھینکس! دیکھو، قسمت اس کو کہتے ہیں، مجھے کل اسلام آباد جانا تھا، بٹ آئی ہیڈ ٹو کینسل مائی سیٹ فار سم ریزنس۔ آج تمہاری کمپنی انجوائے کرنا مقدر میں تھا، وہاٹ اے لک؟''

''اسلام آباد کیسے جا رہے ہو؟''

''آئی ہیو بین اپائنٹڈ ایز......'' (I have been appointed as)

''ریلی (Really)؟''

''یس یس، بس اللہ کی مہربانی ہے''

''کانگریچولیشنز! یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے''

''سو کائنڈ آف یو، لیکن نیا نیا معاملہ ہے، اس لئے کچھ فکر بھی ہے''

''ڈونٹ وری اباؤٹ دیٹ، ماشاء اللہ تم بڑے انٹیلی جنٹ آدمی ہو، اینڈ آئی تھنک کہ تمہارا سلیکشن بہت مناسب ہے، اٹ از گوئنگ ٹو بی آل رائٹ''

یہ اس گفتگو کے چند ابتدائی جملے تھے، پھر سارے راستے اسی اسلوب میں گفتگو جاری رہی جس میں کم از کم پچھتر فی صد الفاظ انگریزی کے تھے، اور پچیس فی صد اردو کے، ان صاحبان کی گفتگو کا حوالہ تو میں نے محض نمونے کے طور پر دے دیا، ورنہ ہمارے نو تعلیم یافتہ حلقوں میں بیشتر جگہوں پر اب بات چیت اسی انداز کی ہوتی ہے، پہلے اصل گفتگو اردو یا کسی اور مقامی زبان میں ہوتی تھی، اور بیچ بیچ میں انگریزی الفاظ یا فقرے آجایا کرتے تھے، اب معاملہ الٹ ہو گیا ہے، اب اکثریت انگریزی الفاظ اور فقروں کی ہوتی ہے، البتہ بیچ بیچ میں کہیں کہیں اردو، پنجابی یا کسی اور دیسی

زبان کے فقرے فٹ کر دیئے جاتے ہیں، بلکہ ایسا بھی بکثرت ہوتا ہے کہ ایک ہی فقرے کا کچھ حصہ انگریزی میں اور کچھ حصہ اپنی زبان میں ہوتا ہے۔

چونکہ اونچے تعلیم یافتہ حلقوں میں اس قسم کی ملی جلی زبان کا استعمال اب ایک فیشن بن گیا ہے، اس لئے جو لوگ اپنی تعلیم یا عہدہ ومنصب کے لحاظ سے اس مقام پر نہیں ہیں وہ بھی اپنے تعلیم یافتہ ہونے کا اظہار کرنے کے لئے اپنی بساط کی حد تک انگریزی کے استعمال کی باقاعدہ کوشش کرتے ہیں، اور نتیجہ یہ ہے جو شخص جتنے انگریزی الفاظ بول سکتا ہے، ان کے بولنے میں کسر نہیں چھوڑتا، یہاں تک کہ غلط اور بے محل الفاظ بولنے سے بھی گریز نہیں کیا جاتا۔

انگریزی بلاشبہ اس وقت بین الاقوامی زبان ہے، اور دنیا کے مختلف باشندوں کے درمیان رابطے کا واحد مشترک ذریعہ بھی، اس کے علاوہ اس زبان کے پاس جدید علوم وفنون کا بڑا ذخیرہ بھی ہے، اس لئے اسکو زبان کی حیثیت سے سیکھنا آج کی دنیا میں ناگزیر جیسا ہوگیا ہے، اور اگر اس غرض سے ہمارے یہاں انگریزی پڑھی اور پڑھائی جاتی ہے، تو اس میں ہرگز کوئی عیب کی بات نہیں، لیکن کسی زبان کو ضرورۃً سیکھنا اور بات ہے، اور اس زبان کا غلام بن کر اپنی زبان کو اس کے آگے ذبح کرڈالنا دوسری چیز۔ ہمارا معاملہ یہ ہے کہ جس کام کے لئے واقعۃً انگریزی کی جو صلاحیت پہلے صرف میٹرک پاس لوگوں میں ہوا کرتی تھی، اب گریجویٹس تو کیا؟ بعض اوقات ماسٹر کی ڈگری رکھنے والوں میں بھی نہیں ہوتی، جدید درسگاہوں کے بہت سے فارغ التحصیل افراد کا حال یہ ہے کہ وہ ایک صفحہ بھی صحیح انگریزی میں نہیں لکھ سکتے، نہ کوئی انگریزی کتاب پڑھ کر سمجھنے کی صلاحیت رکھتے ہیں، لیکن روزمرہ کی بول چال میں انگریزی کا جا و بیجا استعمال ہے کہ اس میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، اور اسے معیار فضیلت سمجھا جا رہا ہے۔

اس رجحان کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری دیسی زبانیں بیچارگی کا شکار ہیں، لوگ اپنی مادری زبان کو بہتر بنانے کے بجائے اس کوشش میں ہیں کہ اس میں زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ داخل کر کے اپنا علمی قد اونچا کریں، اس کوشش سے انگریزی کی صلاحیت میں تو کوئی قابل ذکر اضافہ نہیں ہو رہا، لیکن مادری زبان سے ناواقفیت اس درجہ عام ہوگئی ہے کہ خدا کی پناہ! لوگوں کو اس بات تک کا احساس نہیں رہا کہ ''تشریف لانا'' کب بولا جاتا ہے؟ اور ''حاضر ہونا'' کب؟ چنانچہ اس قسم کے فقرے عام طور سے سننے میں آتے ہیں کہ ''میں آپ کے پاس تشریف لایا تھا'' اور ''آپ میرے پاس حاضر ہوئے تھے'' اسی طرح ''عرض کرنے'' اور ''فرمانے'' کے محل استعمال میں بھی اسی قسم کی الٹ پلٹ روزمرہ کا معمول ہے، ''آپ نے عرض کیا تھا'' اور میں نے فرمایا تھا'' جیسے جملے بعض اوقات اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں سے بھی سننے میں آجاتے ہیں۔

میرے ایک دوست، جو ایک اعلی سرکاری افسر ہیں، سنا رہے تھے کہ میں نے ایک مرتبہ اپنے دفتر کے ایک ساتھی سے کہا کہ ''کل میں ایک تقریب میں شرکت کے لئے چلا گیا تھا'' یہ جملہ سن کر میرے ساتھی نے اعتراض کیا کہ ''تم عربی بہت بولنے لگے ہو'' میں نے کہا ''معاف کیجئے، میرا مطلب یہ تھا کہ ایک فنکشن اٹینڈ کرنے کے لئے گیا تھا'' انہوں نے فرمایا ''ہاں، اب تم نے اردو میں بات کی''۔

اندازہ کیجئے کہ جس ماحول میں ''تقریب'' اور ''شرکت'' جیسے الفاظ استعمال کرنے کو عربی بولنے سے تعبیر کیا جا رہا ہو، وہاں دوسرے علمی اور ادبی الفاظ کو خدا جانے کیا سمجھا جاتا ہوگا؟ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری دینی، علمی، ادبی اور صحافتی زبان کا تقریبا دو تہائی حصہ، نہ صرف عام لوگوں کے لئے، بلکہ ان اعلی تعلیم یافتہ لوگوں کے لئے بھی اجنبی بن چکا ہے، جن کی تربیت انگریزی کے زیرسایہ ہوئی ہے۔ عہد حاضر کے مشہور مورخ ٹائن بی نے اپنی کتاب ''مطالعہ تہذیب'' میں لکھا تھا کہ پہلے زمانے میں کئی بادشاہوں نے اپنے مخالفوں کا ملک فتح کرنے کے بعد ان کے کتب خانے جلائے تھے، (مثلا اندلس میں عیسائیوں نے مسلمانوں کے عظیم الشان علمی خزانوں کو نذرِ آتش کیا تھا) مقصد یہ تھا کہ اس قوم کا رابطہ اپنے ماضی سے کٹ جائے، لیکن مصطفی کمال اتاترک نے ترکی میں ایک ایسا

آسان راستہ اختیار کیا کہ کتب خانے جلانے کی بدنامی بھی اٹھانی نہیں پڑی، وہ آسان راستہ یہ تھا کہ اس نے ترکی قوم کا رسم الخط بدل دیا، اب کتب خانے تو جوں کے توں محفوظ رہے، لیکن اگلے وقتوں کے چند بوڑھوں کے سوا ان سے استفادہ کرنے والا کوئی باقی نہ رہا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے ساتھ کمال اتاترک کے راستے سے بھی زیادہ آسان راستہ اختیار کیا جارہا ہے، ہمارے کتب خانے بھی جوں کے توں محفوظ ہیں، رسم الخط بھی وہی کا وہی ہے، لیکن عربی اور فارسی تو کجا، خود اردو زبان کو بھی ہمارے لئے ایسا اجنبی بنایا جارہا ہے کہ اس کے علمی اور ادبی الفاظ ہمارے لئے اچنبھے بن کر رہ جائیں، اور ہم اپنے دینی، علمی اور ادبی ذخیروں سے استفادہ کے قابل نہ رہیں، چنانچہ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ ہمارے صرف عام لوگ ہی نہیں بلکہ بہت سے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات بھی جو انگریزی اردو کی ملی جلی زبان کے عادی بن گئے ہیں، اردو کی علمی کتابوں کے مطالعے میں سخت مشکل محسوس کرتے ہیں، وہ اردو کی ادبی عبارتوں سے لطف نہیں لے سکتے، غالب، ذوق اور انیس کو تو چھوڑیئے، وہ اقبال مرحوم تک کے اشعار ٹھیک ٹھیک سمجھنے پر قادر نہیں، نہ ان اشعار میں پوشیدہ افکار، تلمیحات اور مضامین کا صحیح ادراک کرسکتے ہیں۔

اسی وجہ سے میں یہ عرض کررہا ہوں کہ عام بول چال میں انگریزی کا بے تحاشا استعمال اب ہمارے لئے ایک لمحۂ فکریہ بن چکا ہے جس پر ملک وملت کے اہل فکر کو پوری سنجیدگی سے غور کرنا چاہیے، پہلے یہ استعمال صرف بول چال کی حد تک محدود تھا، لیکن اب رفتہ رفتہ ہماری تحریروں میں بھی تیزی سے داخل ہورہا ہے، اور اب ایسی تحریروں میں اضافہ ہورہا ہے جو انگریزی الفاظ سے بھری ہوئی ہوتی ہیں۔

ہمارے اہل فکر، اہلِ دانش اور اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات کو اس صورتِ حال کا پوری بیدار مغزی سے جائزہ لینا چاہیے، جب تک وہ خود اپنے عمل سے انگریزی کی اس غلامی سے آزادی کی کوشش نہیں کریں گے یہ تشویشناک رجحان بڑھتا چلا جائے گا، اور ہم ایک ایسی قوم بن کر رہ جائیں گے جس کی اپنی کوئی زبان نہیں، بیشک انگریزی کے کچھ الفاظ ایسے ہیں جنہیں اردو زبان نے اپنے مزاج کے مطابق قبول کر کے انہیں اپنے اندر سمولیا ہے، ایسے الفاظ کے استعمال سے کوئی نقصان نہیں ہوتا، مختلف زبانوں میں الفاظ کا یہ تبادلہ ہوتا ہی رہتا ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ان مقامات پر بھی انگریزی الفاظ اور جملے استعمال کریں، جہاں مطلب اردو یا اپنی کسی دوسری مقامی زبان میں آسانی سے ادا ہوسکتا ہو، یا وہ الفاظ استعمال کریں جو زبان میں جذب ہونے کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ تعلیمی اغراض کے لئے انگریزی دنیا کے بیشتر ملکوں میں پڑھائی جارہی ہے، لیکن جو دیوانگی ہم نے اختیار کی ہے، وہ شاید کہیں اور اختیار نہیں کی گئی۔ برطانیہ کے سوا یورپ کے کسی ملک میں انگریزی نہیں بولی جاتی، وہ انگریزی جاننے کے باوجود انگریزی نہیں بولتے، بلکہ بعض مرتبہ بداخلاقی کی حد تک غیر ملکیوں کے سامنے اپنی زبان بولے چلے جاتے ہیں، خاص طور پر فرانس میں مجھے اس کا تجربہ ہوا، اور اس کی وجہ سے خاصی پریشانی اٹھانی پڑی۔ انگریزی وہ بھی پڑھاتے ہیں، مگر انہوں نے اسے اپنے اوپر سوار ہونے نہیں دیا۔

چونکہ جا وبیجا انگریزی بولنے کی عادت پڑ چکی ہے، اور انگریزی تعبیرات زبان پر چڑھ چکی ہیں، اس لئے شاید شروع شروع میں اس طریقے کو چھوڑنے میں کچھ دشواری ہوگی، لیکن یہ یاد رکھئے کہ اس ناعاقبت اندیشانہ طرز عمل پر اصرار اپنی نسلوں کو مادری زبان اور اس میں موجود شاندار علمی اور ادبی سرمائے سے سراسر محروم کرنے کے مرادف ہوگا۔ زبان صرف ایک اتفاقی ذریعہ اظہار نہیں ہے، بلکہ یہ کسی عقیدہ وفکر اور تہذیب وثقافت کے ساتھ رشتہ جوڑنے کا ایک مؤثر ذریعہ بھی ہے، لہٰذا اپنی زبان سے دست برداری کا مطلب اپنے پورے ماضی سے، اپنے عقیدے اور اپنی فکر سے، اور اپنی تہذیب اور ثقافت سے منہ موڑنا ہے، اگر ہمیں اپنی نسلوں کو اس ہولناک اقدام سے بچانا ہے تو ہمیں اپنی یہ عادت بدلنی ہوگی۔

☆☆☆

آخری صفحہ

نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب

(م۔ق۔ن)

مفکر اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ کی شاہکار تصنیفات میں سے ایک کتاب ''دعوتِ فکر وعمل'' بھی ہے، یہ کتاب دراصل ان خطبات اوتقاریر کا مجموعہ ہے جو پڑوسی ملک پاکستان میں پیش کیے گئے تھے۔

مذکورہ کتاب میں ایک جگہ نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب کیا ہے؟ اس حوالے سے ایک حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''عمان میں ایک مقابلہ تھا، استاد کامل الشریف، میں اور سعودی عرب کے ایک فاضل شیخ احمد جمال تینوں سے سوال کئے جارہے تھے، یہ مکالمہ ریڈیو پر بھی نشر ہورہا تھا، مجھ سے کہا گیا، اس وقت کی سب سے بڑی مصیبت، خصوصاً نوجوانوں کی پریشانی کا اصل سبب کیا ہے؟ میں نے کہا زندگی کا تضاد، وہ بیک وقت متضاد چیزیں دیکھتے ہیں، گھر کا نقشہ کچھ دیکھتے ہیں، باپ دادا کی روایت کچھ سنتے ہیں، اسکول یا کالج جاکر کچھ سنتے ہیں، لٹریچر پڑھتے ہیں تو اس میں کچھ دعوت پاتے ہیں، ٹیلی ویژن اور ریڈیو ان کو کچھ اور دیتا ہے۔ اس صورت حال نے ایسا کنفیوژن پیدا کردیا ہے، ایسا دماغی تضاد اور انتشار پھیلا دیا ہے کہ راہ عمل متعین نہیں ہو پاتی۔ جب یہ حالت ہے کہ ایک گاڑی میں دو گھوڑے جتے ہوئے ہیں، ایک مغرب کی طرف لے جارہا ہے، دوسرا مشرق کی طرف تو اس گاڑی اور اس پر بیٹھنے والے مسافر کا اللہ ہی حافظ ہے''۔ (دعوت فکر وعمل: ۱۳۶)

اسلامی خطوط پر بچوں کی تعلیم وتربیت اور بچوں کی شخصیت کی نشو ونما میں ناکامی یا کماحقہ کامیابی نہ مل سکنے کے بہت سے اسباب اور وجوہات ہیں، تاہم اس خاص مسئلہ میں ایک بڑی وجہ اور راہ تربیت میں بڑی رکاوٹ تضاد ہے جیسا کہ حضرت مولانا مرحوم نے اس جانب اشارہ فرمایا ہے۔

اس تضاد کی وجہ سے بچے مستقل تذبذب (Confusion) کا شکار رہتے ہیں، نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ کوئی ایک بات بھی اپنے ذہن میں محفوظ نہیں رکھ پاتے، بلکہ عام طور پر یہی ہوتا ہے کہ ان کی ناقص اور خام عقل انہیں جس طرف کھینچ کر لے جاتی ہے وہ اسی طرف دوڑے دوڑے چلے جاتے ہیں اور بالکل غلط طور پر ناپسندیدہ رجحانات کی پیروی کرنے لگتے ہیں، وہ مسجد اور مدرسے میں پڑھتے اور سنتے ہیں کہ ان کے لئے جو لوگ نمونہ اور اسوہ ہیں وہ انبیاء اور صالحین ہیں، جب اسکول جاتے ہیں تو انہیں معلوم ہوتا ہے کہ سقراط، بقراط ارسطو اور افلاطون جیسے عظیم المرتبت لوگ ان کے لئے نمونہ اور اسوہ ہیں جب کہ اسکول اور مدرسہ کے باہر وہ بڑی آسانی سے فلمی ہستیوں اور عالمی پیمانہ پر مشہور کھلاڑیوں کو اپنا بنا لیتے ہیں۔

اس تضاد کو ختم کرنا، گھر اور باہر کے ماحول میں وحدت اور یکسانیت پیدا کرنا اور بچوں کو یہ باور کرانا کہ تمہارے لئے حقیقی اور دائمی نمونہ قرآن حدیث اور انبیاء ورسل ہیں، یہ تمام گارجنوں اور مربیوں کی ذمہ داری ہے۔ اللہ ہم سب کو اس ذمہ داری کو ادا کرنے کی توفیق بخشے۔ آمین۔

☆☆☆

(بقیہ صفحہ نمبر ۳۰ کا......)

اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی ہے کہ ہرفن پرایک ایک شخص اس طرح قدرت حاصل کرکے اس کی قدیم وجدید کتابوں پر پوری طرح حاوی ہواوردونوں طریقوں کے درمیان جوخلیج ہے اس کو پاٹنے کی کوشش کرے،مثلاً حساب کی قدیم کتابیں جو بیشترعربی یافارسی میں اور جدید کتابیں جو بیشترانگریزی اور دیگر یورپی زبانوں میں ہیں، یاان دونوں قدیم وجدید کتابوں یاان کے اردوترجمے پیش نظر رکھ کراس میں تطبیق دینے کی کوشش کرے اورانہیں مدارس میں رائج کیا جائے اورقدیم علماء کی طرح آج کے فضلاء مدارس اس کی تدریس میں حصہ لیں اوراس کی تحصیل کرکے دین کے مسائل حل کرنے کی کوشش کریں، یہ ہماراشرعی اوردینی فریضہ بھی ہے، بہت سے واجبات کی واقفیت اس پرموقوف ہےاوربقول علامہ ابن تیمیہ"مالا يعرف الواجب إلابه فهو واجب."

حوالے

(۱) احیاء العلوم بحوالہ تذکرۃ السامع والمتکلم فی آداب العالم والمتعلم: ازابن جماعہ،تحقیق وتعلیق مولانا سید محمد ہاشم ندوی،مطبوعہ بیروت دارالکتب العلمیہ بیروت ص:۴۴

(۲) کشف الظنون از حاجی خلیفہ ۲/ ۱۵۱۱ استنبول

(۳) شاہ اسماعیل شہید: ازحسین حسنی ص: ۱۳

(۴) مسلمانوں کا نظام تعلیم وتربیت ج: ۲/ص: ۳۹۰،مطبوعہ ممبئی

(۵) اسلامی علوم وفنون ہندوستان میں: مترجم: مولانا ابوالعرفان ندوی،مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ص: ۳۷۸

(۶) حوالہ سابق

(۷) حالات طیب: ازمولانا یعقوب نانوتوی،مطبوعہ مفتی الٰہی بخش اکیڈمی کاندھلہ،تحقیق: مولاناابوالحسن راشد کاندھلوی ص: ۴۸

☆☆☆

جامعۃ البنات حیدرآباد

JAMIATUL BANATH HYDERABAD

شعبہ حفظ عالمیت فضیلت

لڑکیوں کا اعلی ومعیاری دینی ۲۸ سالہ قدیم جامعہ

شہر کے اہم مقامات سے بسوں کی سہولت

دینی تعلیم کے علاوہ انگریزی وکمپیوٹر بھی سکھایا جاتا ہے۔ جس کے لئے خاص کمپیوٹر لیب پوری ضرورتوں سے آراستہ ہے۔

عثمانیہ یونیورسٹی (اورینٹل لینگویجس) کے ذریعہ میٹرک،انٹر،بی اے کے امتحانات بھی دلوائے جاتے ہیں۔

ایک سالہ اسلامک ڈپلومہ (کالج کی طالبات کے لئے) شعبہ تربیت۔ دبلوم العالی فی علوم الشرعیہ۔

(فارغات دینی مدارس کے لئے ایک نادر موقع)

والدین سے گزارش ہے کہ اپنی لڑکیوں کی بہترین تعلیم وتربیت کے لئے اس جامعہ میں داخلہ دلوائیں۔

نوٹ: (۱) اضلاع کے طالبات کے لئے جامعہ میں معیاری ہاسٹل کی سہولت ہے۔ (۲) شہر میں اس جامعہ کی اورکوئی شاخ نہیں ہے۔

JAMIATUL BANATH HYDERABAD
Ac/No. 05110011021119. (Andhra Bank)
Ac/No. 19380100018623 (Bank of Baroda)

صاحب خیر حضرات جو جامعہ کا تعاون کرنا چاہتے ہیں ہمارے بینک اکاونٹ نمبرس:

پتہ: جیون یارجنگ کالونی،روبرومدینہ میڈیکل ہال، VIP اسکول کی گلی،سعیدآباد،حیدرآباد۔

رابطہ نمبر: 7032101979,9848431304,(040)24553534

Website:www.jamiatulbanath.org